بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

مولانا فضل الرحمٰن پر حملہ	مولانا محمد حنیف جالدھری	۳
خلفائے راشدین کی باہمی الفت	مفتی غلام قادر	۶
مدرسہ کا نظم ونسق اور نظام تعلیم	مولانا عبدالغفار	۱۳
تجوید، اکابر کی نظر میں	قاری محمد تقی الاسلام	۲۲
مخدوم ہاشم ٹھٹوی کی مطبوعہ تصانیف	ڈاکٹر ادریس سومرو	۲۷
دینی اور عصری علوم	مولانا محمد اعظم	۳۹
اردو کا ملی تشخص	پروفیسر غازی علم الدین	۴۵
اجتماعی اقدار کی تشکیل میں دینی مدارس کا کردار	سہیل اختر قاسمی	۵۹
اخبار الوفاق	ادارہ	۶۱

سالانہ بدل اشتراک

بیرون ملک امریکہ، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور یورپی ممالک ۳۰ ڈالر- سعودی عرب، انڈیا اور متحدہ امارات وغیرہ ۲۳ ڈالر- ایران، بنگلہ دیش ۲۰ ڈالر-

اندرون ملک قیمت: فی شمارہ: 25 روپے، زر سالانہ مع ڈاک خرچ: 300 روپے

monthlywifaq@gmail.com

مولانا فضل الرحمٰن پر حملہ.....ایک لمحہ فکریہ

مولانا قاری محمد حنیف جالندھری
ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

وطن عزیز پاکستان میں علماءِ اہل حق اور دینی مدارس کے اساتذہ وطلبہ کے قتل کی جو افسوسناک روش چل نکلی ہے اس پر جس قدر افسوس اور تشویش کا اظہار کیا جائے کم ہے۔ اگر ہم گزشتہ چند برسوں پر نگاہ ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ کراچی سے لے کر بلوچستان تک اور راولپنڈی اسلام آباد سے لے کر خیبر پختونخواہ تک بے شمار علمائے کرام کی نعشیں اور مدارس دینیہ کے طلبہ کا بہتا لہو نظر آئے گا۔ ان تمام علماء کرام اور دینی مدارس کے اساتذہ میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ ان میں سے جو زیادہ باصلاحیت، سمجھدار اور ذی شعور ہوتا ہے، جس کا عوامی رابطہ جتنا زیادہ مستحکم ہوتا ہے، جو امن وسکون کا زیادہ داعی ہوتا ہے اور جو حب الوطنی کا جتنا زیادہ اظہار اور پرچار کرتا ہے وہ کسی اندھی گولی کی نذر ہو جاتا ہے اور پھر نہ اس پر کوئی تحقیق ہوتی ہے، نہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی طرف سے سنجیدگی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، نہ کبھی قاتلوں تک رسائی حاصل کی جاتی ہے، نہ ذمہ داروں کو کیفر کردار تک پہنچایا جاتا ہے اور نہ ہی ان علماء کے قتل کے پس پردہ سازشوں کو بے نقاب کروایا جاتا ہے اور پھر کچھ عرصے کی خاموشی کے بعد ایک اور نعش، لہو کی ایک اور نہر اور ایک اور حادثہ ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔

آپ مولانا فضل الرحمٰن پر ہونے والے حملوں کی مثال لے لیجئے۔ ان حملوں کو مذہبی انتہا پسندوں کے ساتھ ہر قیمت پر نتھی کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، بغیر کسی تحقیق کے حملے کی جو نوعیت بیان کی جاتی ہے اس کے بعد اسے ہی دہرایا جاتا ہے۔ نہ اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ یہ خودکش حملہ تھا؟ بم دھماکہ تھا یا قاتلانہ حملہ؟ نہ اس حملے کے طریقہ واردات کا جائزہ لیا جاتا ہے اور نہ ہی یہ سوچا جاتا ہے کہ آخر وہ کون سی قوتیں ہیں جو مولانا فضل الرحمٰن کی جان کے درپے ہو سکتی ہیں؟ بالکل بجا کہ مولانا فضل الرحمٰن پُرامن جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں، لاریب کہ آئین اور قانون کی بات کرتے ہیں، بلاشبہ

وہ شدت پسند نوجوانوں کو صبر وتحمل کی تلقین کرتے ہیں اور مدتوں سے کرتے چلے آرہے ہیں، انہوں نے مسلسل نسلِ نو کو یہ باور کروانے کی سعی کی کہ وہ حکمتِ عملی جس کے نتیجے میں منزل نظروں سے اوجھل ہوجائے وہ قطعاً دانش مندی کا تقاضہ نہیں بلکہ درست حکمت عملی یہ ہے کہ اس راستے کا انتخاب کیا جائے جس سے منزل قریب سے قریب تر ہوتی چلی جائے۔ مولانا کے اس فکر وفلسفے سے کسی کو لاکھ اختلاف سہی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ لوگ مولانا کی جان کے درپے ہو جائیں گے۔ یہ بھی ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ جہاں بعض لوگ مولانا سے اختلاف رکھتے ہیں وہیں وزیرستان سے لے کر بلوچستان تک ایسے لوگوں کی بھی بڑی تعداد موجود ہے جو مولانا سے عقیدت ومحبت کا دَم بھرتے ہیں اس لیے اس واقعے کو محض ایک زاویے سے دیکھنے کے بجائے ہر جہت سے دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے اور اس کی روشنی مین مستقبل کی ترجیحات اور اہداف کے تعیین کی حاجت ہے۔

ہمیں سب سے پہلے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ آخر وہ کون سی قوتیں ہیں جو اپنے مقاصد اور اہداف کے راستے میں مولانا کو رکاوٹ سمجھتی ہیں۔ اگر ہم اقتدار کے ایوانوں اور سیاست کی بھول بھلیوں میں لحہ بہ لحہ بدلتی صورتحال اور اس میں مولانا فضل الرحمٰن کے کردار کا جائزہ لیں تو ہمارے سامنے کچھ اور صورتحال آتی ہے، اگر ہم افغانستان سے بوریہ بستر گول کر کے واپس پلٹنے والی طاغوتی طاقتوں کے اس خطے میں مستقبل کی منصوبہ بندی کا تجزیہ کریں تو ہمیں مولانا فضل الرحمٰن استعمار کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ دکھائی دیتے ہیں اور اگر ہم مشرق وسطیٰ میں شیعہ سنی بنیادوں پر پنپنے والے ماحول کو سامنے رکھیں اور اس ماحول اور اس منظر نامے کو پاکستان کی طرف ایکسپورٹ کرنے والوں کے ارادے اور ان کے آقاؤں کی منصوبہ بندی کا جائزہ لیں تو صرف مولانا فضل الرحمٰن ہی نہیں بلکہ بہت سے ایسے اتحاد واتفاق کے علمبردار لوگ اور وطن عزیز کو فرقہ وارانہ بنیادوں پر کشت وخون کے سمندر میں جانے سے بچانے کی جدوجہد کرنے والے جملہ علماء کرام کی زندگیاں شدید ترین خطرے میں نظر آتی ہیں۔ اس لیے مولانا فضل الرحمٰن پر ہونے والے حملے کو معمول کی ایک واردات سمجھ کر ٹال دینا انتہائی ناانصافی اور ناعاقبت اندیشی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جہاں عوام الناس اور خاص طور پر مذہبی طبقے کو اس صورتحال کا ادراک ہونا چاہیے اور امت کے بدلتے ہوئے حالات کو پیش نظر رکھنا ہوگا وہیں مستقبل کے چیلنجز اور دشمن کی منصوبہ بندیوں سے بھی باخبر رہنا ہوگا۔ سب سے اہم اور سب سے زیادہ بھاری ذمہ داریاں حکومت وقت پر عائد ہوتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حکمرانوں کا رویہ غیر ذمہ دارانہ اور جانبدارانہ ہے۔ کتنے علماء شہید ہوتے ہیں لیکن حکمران ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ایک حادثے کے بعد دوسرا حادثہ ہوجاتا ہے لیکن قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہاں حفظِ ماتقدم یا منصوبہ بندی نام کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ آپ برطانیہ کی مثال لے لیں وہاں سیون سیون کا حادثہ ہوا اور اس کے بعد کوئی دوسرا سیون سیون وقوع پذیر نہیں ہوا، امریکا میں نائن الیون کے بعد سے لے کر آج تک راوی ہر طرف چین ہی چین لکھتا ہے اور تو اور انڈیا میں برسوں پہلے کسی

ایک آدھ حملے کا واقعہ ہوا اور اس واقعے کی آڑ میں انڈیا نے سچی جھوٹی کہانیاں تراش کر آج تک پاکستان کی ناک میں دَم کر رکھا ہے جبکہ پاکستان میں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن پر ہونے والا حملہ ایک ٹیسٹ کیس کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے حملے کے بعد دوسرے حملے کا ہو جانا اور دونوں حملوں میں مولانا کا کراماتی طور پر بچ نکلنا محض اللہ رب العزت کا فضل و کرم ہے لیکن یاد رہے کہ مولانا کو اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھنے والے کبھی چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ اس لیے خود مولانا اور ان کی جماعت کو بھی فکر مند ہونا پڑے گا اور خاص طور پر حکمرانوں کو بہر حال پیش بندی کرنا ہوگی کیونکہ صرف مولانا ہی نہیں بلکہ اس ملک کے تمام معتدل مزاج، پرامن، محبِّ وطن، باصلاحیت اور عوامی اثر و رسوخ رکھنے والے علماء کرام دشمن کا ہدف ہیں حکمرانوں کو اپنی غیر ذمہ داری، جانبداری، بے حسی اور غفلت والی روش ترک کر کے اس صورتحال کو کنٹرول کرنا ہوگا ورنہ ؎

لمحوں نے خطا کی تو صدیوں نے سزا پائی

☆.....☆.....☆

خلفائے راشدین کی باہمی اُلفت ومحبت

مفتی غلام قادر

ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ کے خلفائے راشدینؓ باہم محبت، الفت اور یگانگت کے اوصاف سے مزین تھے۔ ہمارے اس دعوے کے اصل دلائل قرآن مجید کی آیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صفاتِ حمیدہ کا بیان فرمایا ہے کہ ان میں اخوت و برادری قائم ہے۔ ان میں غم خواری ومحبت کا رشتہ موجود ہے۔ ان کے قلوب میں نرمی والفت پیدا کردی گئی ہے۔ یہ باہمی ولایت و دوستی جیسے خصائل سے متصف ہیں۔ آپس میں رحم دلی اور مہربانی کی شان ان میں ہمیشہ پائی جاتی ہے۔ یہ حضرات رافت وشفقت کے زیور سے آراستہ ہیں۔ غم خواری وغمگساری کے خوگر ہیں، پاس داری ان کا طریقہ کار ہے۔ حق شناسی وقدردانی ان کا شعار ہے، خوش روئی اور خوش خلقی ان کا کام ہے۔ صحابہ کرامؓ بالخصوص خلفائے راشدینؓ کی باہمی مودت ومحبت پر حسب ذیل آیات دلالت کرتی ہیں:

(۱).....هوالذی ایدك بنصره وبالمومنینo والّف بین قلوبهم

وہی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے آپ (ﷺ) کو اپنی مدد اور مسلمانوں کی تائید سے قوت دی اور ان کے دلوں میں الفت ڈال دی۔

(۲).....ان الّذین امنوا وهاجروا وجهدوا باموالهم وانفسهم فی سبیل اللّٰه والذین اٰوَوا ونصروا اولئك بعضهم اولیآء بعض

تحقیق جولوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مالوں اور جانوں کے ذریعے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے (مہاجرین) کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، یہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور رفیق ہیں۔

(۳).....محمدرسول اللّٰہ والذین معہ اشدآء علی الکفارِ رحمآء بینھم

محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ اللہ کے رسول کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابلے میں سخت ہیں اور آپس میں ایک دوسرے پر رحم دل ہیں۔

قرآن مجید میں اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں۔ اس جگہ صرف تین آیات کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا مفہوم اپنی جگہ واضح ہے۔ آیت نمبر تین میں حضور کی معیت میں زندگی گزارنے والے صحابہ کرامؓ کی بہت سی صفات کا ذکر کیا گیا ہے، یہاں صرف ان کے ایک وصف رحماء بینھم کا مختصر سا بیان منظور و مطلوب ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی یہ جماعت باہمی وصف رحمت کے ساتھ متصف ہے۔

اس ارحم الرحمین جل وعلا نے اپنے برگزیدہ پیغمبر علیہ السلام کو سراپا رحمت دو عالم بنا کر بھیجا ہے۔ ان کے خاص شاگردوں کو، ان کے خاص خدام کو، ان کے جانثاروں کو، ان کے ساتھ ہر وقت رہنے والوں کو اس صفت رحمت، شفقت، الفت، محبت اور دوستی کے ساتھ متصف فرمایا ہے۔ یہ حضرات آپس میں رحیم ہیں، باہم شفیق ہیں، ایک دوسرے کے دوست اور محبّ ہیں۔ پھر یہ صفت رحمت صرف چند ایک صحابہ کرام کے لیے نہیں بلکہ تمام صحابہ کرامؓ کے لیے ہے، بالخصوص خلفائے راشدینؓ کہ وہ مدۃ العمر اس خصوصی صفت پر قائم ودائم رہے ہیں۔

چند واقعات پیش خدمت ہیں جن سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ خلفائے راشدینؓ کے درمیان رحمت وشفقت، الفت ومحبت موجود تھی۔ خلفائے ثلاثہ سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا حضرت عمر فاروق، سیدنا حضرت عثمان ذوالنورین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا خلیفہ رابع سیدنا حضرت علیؓ اور اہل بیت نبوی کے ساتھ قلبی محبت کا تعلق رہا ہے۔

خاتونِ جنت کا نکاح:.....خاتون جنت سیدہ فاطمہؓ کے نکاح کے لیے سیدنا حضرت ابوبکرؓ، سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کا سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ کو آمادہ کرنا۔

''جلاء العیون'' میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک روز حضرت ابوبکر صدیقؓ و حضرت عمرؓ و حضرت سعدؓ بن معاذ مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خاتون جنت سیدہ حضرت فاطمہؓ کی شادی ونکاح کے متعلق بات چیت ہونے لگی۔ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ سرکار دو عالم ﷺ سے آپ کی لخت جگر خاتونِ جنت سیدہ حضرت فاطمہؓ کی طلب گاری قریش کے شرفانے کی ہے۔ حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ فاطمہؓ کا معاملہ اس کے پروردگار کے سپرد ہے، جس کو چاہے گا اس کو تزویج کردے گا اور سیدنا حضرت علیؓ ابن ابوطالب نے اس معاملے میں نہ خود آنحضرت ﷺ سے کوئی بات کی ہے، نہ اس کے لیے حضور ﷺ سے کسی نے کہا ہے۔

سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ سیدنا حضرت عمر فاروقؓ اور سیدنا حضرت سعدؓ کو کہا اٹھو! حضرت علی ابن ابوطالب کے پاس چلیں اور ان کو طلب گاری فاطمہؓ کے لیے تیار کریں۔ اگر ان کو تنگ دستی مانع ہو تو ان کی مدد کریں، چنانچہ تینوں حضرات

یعنی سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ، سیدنا عمر فاروقؓ اور سیدنا حضرت سعدؓ اسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور سیدنا حضرت علیؓ کی خدمت میں پہنچ گئے، سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ کیسے آنا ہوا؟ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ آپ نیک خصلتوں میں دوسرے لوگوں سے سبقت کیے ہوئے ہیں اور حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ساتھ آپ کا نسبی رشتہ بھی دوسروں کی بہ نسبت قریب تر ہے، ہم نشینی بھی دائمی نصیب ہے، آپ کو طلب گاری فاطمہؓ سے کون سا امر مانع ہے؟ میرا گمان ہے کہ خدا اور رسول ﷺ نے یہ رشتہ آپ کے لیے رکھا ہوا ہے۔ جب سیدنا حضرت علیؓ نے سیدنا حضرت ابوبکرؓ کی بات سنی تو کہا کہ آپ نے میرے سینے کی پوشیدہ آرزو کو برانگیختہ کر دیا ہے۔ میں اس خواست گاری کی طلب رکھتا ہوں۔ لیکن تنگ دستی کی وجہ سے میں اس چیز کے اظہار میں شرم محسوس کرتا ہوں۔

ان تینوں حضرات یعنی سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ، سیدنا عمر فاروقؓ، سیدنا سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے سیدنا حضرت علیؓ کو اس کام کے لیے آمادہ کیا۔ چنانچہ حضرت علیؓ حضرت رسالت مآب ﷺ کے گھر تشریف لے گئے۔ اس واقعے میں خلیفہ اول سیدنا حضرت ابوبکرؓ اور امیر المومنین سیدنا عمر فاروقؓ کا خلیفہ رابع کے ساتھ خیر خواہی اور قلبی تعلق کا واضح اظہار ہوتا ہے۔

نکاح کا اہتمام:..... ملا محمد باقر مجلسی نے بحار الانوار جلد ۱۰ میں ایک روایت نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ کہتے ہیں کہ میں نے جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں درخواست پیش کی تو رسول ﷺ نے میری طرف متوجہ ہو کر حکم فرمایا: جا کر اپنی زرہ بیچ ڈالیے اور جو رقم حاصل ہو وہ میرے پاس لائیے تا کہ تمھارے اور لختِ جگر فاطمہؓ کے لیے جو ضرورت کی چیزیں ہوں ان کی تیاری کی جائے۔ سیدنا حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے زرہ اُٹھالی اور مدینہ طیبہ کے بازار میں چلا گیا۔ یہ زرہ میں نے سیدنا حضرت عثمان بن عفانؓ کے ہاتھ چار سو درہم میں فروخت کر دی۔ جب میں نے یہ دام لے لیے اور سیدنا حضرت عثمان بن عفانؓ نے زرہ اپنے قبضے میں لے لی تو اس پر سیدنا حضرت عثمانؓ بولے، لیجیے! یہ زرہ میری طرف سے آپ کے لیے ہدیہ ہے۔ سیدنا حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے زرہ اور درہم دونوں چیزیں لے لیں اور حضرت رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ دونوں چیزیں آپ کے سامنے رکھ دیں اور سارا واقعہ حضور کی خدمت میں بیان کیا۔

حضور ﷺ نے سیدنا حضرت عثمانؓ کے حق میں دعائے خیر کے کلمات فرمائے۔ پھر سیدنا حضرت ابوبکرؓ کو بلا کر ان دراہم سے ایک مٹھی بھر کر عنایت فرمائی اور کہا کہ اس رقم سے فاطمہؓ کے لیے خانگی ضروریات کی چیزیں خرید کر کے لاؤ اور سیدنا سلمان فارسیؓ اور سیدنا حضرت بلالؓ کو سیدنا حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ روانہ کیا کہ خرید شدہ چیزوں کو اُٹھا کر لانے میں ان کی مدد کریں۔ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے جو دراہم مجھے عنایت فرمائے وہ ۶۳ تھے، میں نے بازار جا کر ایک مصری بچھونا، چمڑے کا ایک گدا، چمڑے کا ایک بالین جو کھجور کی چھال سے پر تھا، خیبری قسم کی ایک چادر، پانی کے لیے ایک مشکیزہ، کوزے، گھڑے، وضو کے پانی کے لیے ایک برتن، صوف کا ایک باریک کپڑا، یہ جملہ سامان

خریدا۔ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کہتے ہیں کہ سامان کچھ میں نے اُٹھالیا اور کچھ حضرت سلمان فارسیؓ و حضرت بلالؓ نے اُٹھالیا اور سب لاکر حضرت رسول کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

مندرجہ بالا روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ سیدہ فاطمہؓ کے جہیز کے لیے جو سامان خریدا گیا تھا اس کی قیمت سیدنا حضرت عثمان بن عفانؓ نے سیدنا حضرت علیؓ کو بطور ہدیہ وتحفہ پیش کی تھی۔ اس ایثار و ہمدردی کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے سیدنا حضرت عثمانؓ کو دعا دی اور ان کے حق میں برکت کے کلمات فرمائے۔

اس رقم سے شادی کے تمام اخراجات پورے ہوئے۔ سیدنا حضرت عثمانؓ اور سیدنا حضرت علیؓ کے مابین الفت ومحبت کا یہ زبردست ثبوت ہے۔ جہاں باہم کدورت ونفرت ہو وہاں ایسی قربانی نہیں ہوسکتی۔ نیز اس روایت میں سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمات سامان کی خریداری کے سلسلے میں اظہر من الشمس ہیں۔ ان سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

سیدہ فاطمہؓ اور سیدنا حضرت علیؓ کے نکاح کی مجلس میں خلفائے ثلاثہؓ کی شرکت اور گواہی:..... شیعی عالم علی بن عیسٰی الاربلی کی کتاب ''کشف الغمہ فی معرفۃ الائمہ'' میں ایک روایت درج ہے۔ جس کا حاصل ترجمہ یہ ہے کہ سیدنا حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں موجود تھا۔ نبی کریم پر وحی نازل ہوئی۔ نزولِ وحی کے بعد حضور نے مجھے ارشاد فرمایا کہ اے انس! تو جانتا ہے کہ صاحب العرش کی طرف سے جبرئیل کیا پیغام لایا ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ فاطمہؓ کی علی ابن طالب کے ساتھ تزویج کردوں۔ پس جاؤ! میرے پاس ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ وطلحہؓ وزبیرؓ کو بلا کر لاؤ اور اتنی ہی تعداد میں انصار کو بھی بلا لاؤ۔ سیدنا حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں چلا گیا اور ان سب حضرات کو حضور ﷺ کے پاس بلا کر لایا۔ جب یہ سارے حضرات آ گئے تو آنحضرت ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا، اس خطبے میں حمد وثنا کی اور نکاح کی اہمیت بیان فرمائی، پھر فرمایا میں سب حاضرین مجلس کو اس چیز کا گواہ بناتا ہوں کہ میں نے فاطمہؓ کا علی ابن طالب کے ساتھ چار سو مثقال مہر کے عوض نکاح کر دیا ہے۔

اس روایت سے ثابت ہوا کہ خلفائے ثلاثہ کو سیدہ فاطمہؓ اور سیدنا حضرت علیؓ کے نکاح کی مجلس میں مدعو کر کے شامل کیا گیا۔ یہ حضرات ثلاثہ بمع دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اس بابرکت نکاح کے گواہ اور شاہد قرار دیئے گئے۔ یہ دونوں چیزیں باہمی ارتباط واتفاق اور اتحاد کی درخشندہ نشانیاں ہیں۔ جن لوگوں کے ساتھ کشیدگی ورنجیدگی اور عداوت ہو ان کو اپنی خصوصی تقریبات میں شامل رکھنا ہرگز گوارہ نہیں ہوا کرتا۔

حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کے انتظامات اور حضرت عائشہؓ اور اُم سلمہؓ کی قابل قدر کوششیں:..... حدیث کی کتاب ابن ماجہ میں ایک روایت ہے کہ اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ واُم المؤمنین اُم سلمہؓ نے ذکر کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا کہ حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کی تم تیاری کرو، تو ہم نے وادی بطحا سے مٹی منگوا کر رخصتی کے مکان کو لیپا پوتا پھر اپنے ہاتھوں سے کھجور کی چھال تیار کر کے دو گدے تیار کیے۔ پھر کھجور اور منقع سے خوراک تیار کی اور میٹھا پانی پینے کے لیے مہیا

کیا اور پھر اس مکان میں ایک لکڑی گاڑ دی تا کہ اس پر کپڑے اور مشکیزہ لٹکایا جا سکے۔ اُمہات المؤمنین حضرت عائشہؓ و اُم سلمہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کی شادی سے بہتر ہم نے کوئی شادی نہیں دیکھی۔

اس روایت سے ثابت ہوا کہ ایک تو نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہؓ و اُم سلمہؓ کو ہی یہ انتظامات مکمل کرنے کا فرمان دیا تھا اور دوسرے یہ کہ اس رخصتی کے متعلقہ انتظامات حضرت عائشہؓ و حضرت اُم سلمہؓ کے ہاتھوں ہی مکمل ہوئے۔

ان تمام واقعات و حالات پر نظر ڈالنے سے واضح ہو رہا ہے کہ اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ اور سیدہ حضرت فاطمہؓ کے درمیان ابتدا ہی سے خوش گوار روابط اور تعلقات قائم تھے۔ ان کے مابین الفت و شفقت ہر مرحلے پر ثابت رہی اور ان کی آپس میں پیوستگی و ہم دردی ہر مقام پر موجود رہی۔ ان پاک دامن طینت بیبیوں کے درمیان کسی قسم کی عداوت و کشیدگی نہ تھی۔ ان کی باہمی انتشار و افتراق کی داستانیں بالکل بے اصل اور دروغ گوئی پر مبنی ہیں۔

خاتون جنت سیدہ فاطمہؓ کی تعریف اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ کی زبانی:.....مستدرک حاکم اور الاستیعاب لابن عبدالبر میں ایک روایت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اُم المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ ذکر کرتی ہیں کہ کلام و گفتگو کرنے میں نبی ﷺ کے ساتھ سیدہ فاطمہؓ سے زیادہ مشابہ میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ جب وہ نبی کریم ﷺ کے پاس تشریف لاتیں تو آپ ان کے لیے کھڑے ہو جاتے، ان کو بوسہ دیتے اور مرحبا کہتے۔ اسی طرح حضرت فاطمہؓ بھی نبی علیہ السلام کے ساتھ ان ہی آداب سے پیش آتی تھیں۔ اس روایت سے ثابت ہوا کہ اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ نے خاتون جنت کی برملا تعریف کی ہے۔

حضرت علیؓ کا بیان:.....خلفائے ثلاثہ کے ساتھ خلیفۂ رابع حضرت علی المرتضیٰؓ کے ارتباط و اتفاق کے ثبوت کے لیے اہم روایت کنز العمال کتاب الفتن میں سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ کا مفصل ارشاد ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب سرور دو عالم ﷺ کا وصال ہو گیا تو مسلمانوں نے خلافت کے معاملے میں غور و فکر کیا۔ معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے امر دین یعنی نماز کے مسئلے میں ابوبکر صدیقؓ کو والی بنایا ہے تو دنیاوی معاملات میں بھی صدیق اکبرؓ کو والی مقرر کرنا چاہیے۔ پس مسلمانوں نے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کی تو میں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ان کی بیعت کی۔ پس جب وہ جہاد کے لیے مجھے کہتے تو میں جہاد میں شریک ہوتا، جب وہ مجھے عطایا و ہدایا دیتے تو میں قبول کرتا۔

سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آخری وقت میں حضرت عمر فاروقؓ کے حق میں اشارہ کیا اور اس معاملے میں انھوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ پس مسلمانوں نے سیدنا حضرت عمر فاروقؓ سے بیعت کی، میں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ حضرت عمرؓ کی بیعت کی۔ جب وہ غزوات میں مجھے طلب کرتے تو میں ان کا شریک کار ہوتا اور جب وہ عطیات و غنائم وغیرہ مجھے عنایت فرماتے تو میں ان کو قبول کرتا۔

پھر حضرت عمر فاروقؓ کی چھ آدمیوں کی منتخب کمیٹی میں مَیں بھی تھا۔ اس صورت میں سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے سیدنا عثمان بن عفانؓ کا ہاتھ پکڑ کر بیعت کی اس وقت میں اپنے دل میں غور کرنے لگا۔ میں نے یہ فکر کیا کہ میرا عہد میری بیعت سے سبقت کر چکا ہے۔ میں نے بھی حضرت عثمانؓ کی بیعت کی۔ جب وہ مجھے جنگی ضرورتوں میں طلب کرتے تو میں غزوات میں شریک ہوتا اور جب وہ مجھے غنائم وعطیات دیتے تو میں ان کو وصول کرتا تھا۔

مندرجہ بالا روایت کے نتائج:

(۱).....سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف سے خلافت کے مسئلے میں جو انتخاب ہوا تھا اس معاملے میں سیدنا حضرت علیؓ موجود تھے اور اس صدیقی تجویز پر راضی تھے۔

(۲).....جس طرح تمام مسلمانوں نے بہ خوشی و بہ رضا سیدنا حضرت عمرؓ سے بیعت کی تھی اسی طرح سیدنا حضرت علیؓ نے بھی سیدنا حضرت فاروق اعظمؓ سے بہ خوشی بیعت کی تھی۔

(۳).....خلافت فاروقی کے جنگی معاملات میں سیدنا حضرت علیؓ شریک کار رہتے تھے اور مال غنیمت وغیرہ کی آمدنی سے اپنا حصہ لیتے تھے۔

(۴).....روایت سے ثابت ہو رہا ہے کہ سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کے نزدیک نہایت معتمد علیہ اور لائق خلافت بزرگ تھے، اس بنا پر چھ افراد کی مجوزہ کمیٹی میں ان کو نمبر اول پر لے لیا گیا۔

(۵).....سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ، سیدنا حضرت عثمان کی خلافت پر غور وفکر کرنے کے بعد رضامند ہوئے تھے اور بیعت لی تھی۔ عہد عثمانی میں جنگی معاملات میں شریک رہتے تھے اور مال غنیمت وغیرہ کی آمدنی سے اپنا حصہ لیتے تھے۔

حضرت علی المرتضیٰؓ اور سیدنا فاروق اعظمؓ:.....علامہ ابن جوزیؒ کی کتاب تاریخ عمرؓ بن خطاب میں ہے۔ نزال کہتا ہے کہ ایک روز ہم سیدنا حضرت علیؓ سے ملے، حضرت علیؓ اس وقت خوشی اور مسرت کی حالت میں تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین! سیدنا عمرؓ بن خطاب کے متعلق کچھ حال بیان فرمائیے۔ انھوں نے فرمایا:

سیدنا عمرؓ بن خطاب وہ بزرگ تھے جن کا نام اللہ تعالیٰ نے فاروق (حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا) رکھا ہے۔ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کہ آپ فرماتے تھے کہ اے اللہ! عمرؓ کے ذریعے اسلام کو غلبہ اور عزت عطا فرما۔

سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ سیدنا حضرت فاروق اعظم کو رجلِ مبارک، نجیب امت، القوی الامین، امام ہدایت، راشد ومرشد کے القاب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

حضرت علیؓ کی اولاد میں خلفائے ثلاثہ کے مبارک ناموں کی ترویج:..... یہ ایک فطری امر ہے کہ آدمی اپنی اولاد کے نام تجویز کرتے وقت پوری احتیاط سے کام لیتا ہے۔ اپنے بیٹے، بیٹیوں کے نام اسی نوعیت کے رکھتا ہے کہ وہ اس زندگی میں باعث عزت وافتخار بنے۔ نام تجویز کرنے سے اس کے ذہن وقلب اور فطری لگاؤ کا پتا لگتا ہے۔ اس ضمن میں بالعموم

قابل احترام معزز اور معروف ایسی ہستیوں کے ناموں کو ترجیح دی جاتی ہے جن کے ساتھ اسے اُنس ومحبت ہو اور انھیں مبارک وعظیم سمجھا جاتا ہو۔ جن لوگوں کے بارے میں دل کے اندر کسی قسم کی کدورت پائی جاتی ہو یا ان سے نفرت ہو ان کے اسما کو اپنی اولاد میں پسند نہیں کیا جاتا۔

اس نفسیاتی اصول اور قلبی لگاؤ کے آئینے میں جب ہم سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ کو دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ آپ کی اولاد میں سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ، سیدنا حضرت عمر فاروقؓ اور سیدنا حضرت عثمانؓ کے مبارک نام ملتے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ خلفائے ثلاثہ کے بارے میں دل کے کسی کونے میں عداوت یا بغض نہیں رکھتے تھے بلکہ انھیں معزز ومحترم اور بزرگ ہستیاں سمجھتے تھے۔ تبھی تو آپ نے اپنی اولاد میں ان اسما کو رواج دیا۔

اس مقالے میں چند نصوص اور روایات وواقعات کا ذکر ہوا ہے۔ جس سے عنوان مقالہ پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ نصوص و روایات اور واقعات مشتے از خروارے کا نمونہ ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو سرکار دوعالم ﷺ کے ازواجِ مطہرات، اہل بیت اور صحابہ کرام بالخصوص خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مودت اور متابعت نصیب فرمائے۔ آمین

☆.....☆.....☆

دینی ادارے کا نظم ونسق اور نظام تعلیم

مولانا عبدالغفار

قال اللہ تبارك وتعالیٰ : لقد منّ الله على المؤمنين اذ بعث فيهم رسولاً من انفسهم يتلوا عليهم آيته ويزكيهم ويعلمهم الكتٰب والحكمة وان كانو من قبل لفى ضلل مبين۔وقال النبى ﷺ انما بعثتُ معلّماً۔ وقال عليه الصلوٰة والسلام : إن الله وملائكتهٗ وأهل السموٰت والأرضين حتى النملة في جحرها وحتى الحوت في الماء ليصلون على معلمي الناس الخير۔

ایک دینی مدرسہ کا نظم ونسق اور اس کا انتظامی ڈھانچہ کس طرح تشکیل پانا چاہئے، جس سے اُس مدرسہ کی کارکردگی اچھی ہو، مدرسہ کا انتظام اچھا ہو، وہ مدرسہ ایک اچھا اور مثالی مدرسہ کہلائے جانے کا مستحق ہو، زیرِنظر مضمون میں ان پر کچھ گذارشات پیش کی گئی ہیں۔

مدرسہ کے تین بنیادی ارکان:..... جب ہم اپنے اس ماحول میں ایک دینی مدرسے کا تصور کرتے ہیں اور دینی مدرسے کو ہم دیکھتے ہیں تو وہاں ہمیں تین چیزیں نظر آتی ہیں: (۱).....اُس مدرسے اور اُس دینی ادارے کے سربراہ، مہتمم یا مدیر۔(۲).....اُس مدرسے میں خدمت انجام دینے والے مدرسین، تعلیم دینے والے اساتذہ اور ملازمین۔(۳) طلباء۔ ہر مدرسہ کے انتظامی ڈھانچہ میں آپ کو یہ تین ارکان ہی نظر آئیں گے۔

رکن اول: مہتمم ادارہ:.....جو مدرسے کے سربراہ اور مہتمم ہوتے ہیں یہ بڑے اولوالعزم لوگ ہوتے ہیں، یہ ہم سب کے شکریے اور خراجِ تحسین کے مستحق ہیں کہ یہ بیچارے کوشش کرکے، محنت کرکے اور تنکا تنکا جوڑ کر ادارہ قائم کرتے ہیں۔ پھر اُس مدرسے میں ہمیں اور آپ کو دین کی خدمت کا موقع ملتا ہے، دیگر کئی ملازمین کو اس میں خدمت کا موقع ملتا ہے۔ یہ ہماری اِس خدمت کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ اب ایک مہتمم کی جو مشکلات ہوتی ہیں وہ اُس کو اور اُس کے خدا کو معلوم ہے۔ مدرس کو مدرسہ کے اخراجات اور اس کی مشکلات کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ طلباء کے خورد ونوش کا انتظام، بجلی کے بل، اِن

کے لئے رقم کی فراہمی، اس طرح تعمیرات، تنخواہیں اور دیگر کئی پریشانیوں کا بوجھ یہ مہتممین حضرات اُٹھاتے ہیں ان مشکلات کو ادارے کا سربراہ جانتا ہے۔

مہتمم حضرات کی ذمہ داریاں؟:.....میں سمجھتا ہوں کہ جب ہم یہ کہیں کہ مدرسے کا انتظام وانصرام اچھا ہونا چاہیے، نظم ونسق خوب سے خوب ہونا چاہئے، وہ مثالی مدرسہ کہلانا چاہئے تو اس میں سب سے بڑا اہم کردار اس ادارے کے مہتمم کا ہوتا ہے۔ ہم اِس مہتمم کو بیچ میں سے نکال نہیں سکتے۔

پہلی چیز: اخلاص:.....ایک ادارے کے سربراہ، مہتمم کو ایک اچھا اور مثالی مدرسہ بنانے کے لئے سب سے پہلے جس چیز کا خیال رکھنا چاہیے وہ اس کی حسن نیت ہے کہ اس نے یہ مدرسہ جو بنایا ہے مقصد اس کا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہو، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہو کہ میں جو مدرسہ قائم کر رہا ہوں، ادارہ قائم کر رہا ہوں تو میرا مقصد یہ ہے کہ یہاں قرآن وسنت کے علوم کی حفاظت بھی ہو، قرآن وسنت کے علوم کی اشاعت بھی، اور قرآن وسنت کے علوم کی ترویج بھی، یہ ہم نے مسلمانوں تک پہنچانا ہے تاکہ سارے کے سارے مسلمان اپنے دین پر صحیح صورت میں عمل کر سکیں اور ظاہر بات ہے یہ بہت نیکی کا کام ہے اور اہم عبادت ہے اور ہر عبادت کے اندر اخلاص کا ہونا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

إنما الأعمال بالنيّات وإنما لإمرىء مانوىٰ، فمن كانت هجرتهٗ إلى الله ورسوله فهجرتهٗ إلى الله ورسوله ومن كانت هجرتهٗ إلى دنيا يصيبها أوامرأةٍيتزوّجهافهجرتهٗ إلى ماهاجر اليه.

تو مہتمم کو اور ہم سب کو اس چیز کا سب سے پہلے خیال رکھنا ہے، اپنے دلوں کو ٹٹولنا ہے، اپنی نیتوں کو صحیح کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لئے جو ادارہ ہوگا یقیناً وہ ادارہ ترقی کرے گا اور وہ ادارہ کامیاب ہوگا، لیکن اللہ نہ کرے! اللہ نہ کرے! اگر یہاں کوئی خرابی آتی ہے اور اس کے اندر کوئی کمی آتی ہے تو وہ ادارہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ کسی نے اگر یہ سوچا کہ چلو دنیا کے روزگار اور کاروبار کے لئے ایک مدرسہ ہی بنا لیتے ہیں تو ایسا ادارہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا، کیوں؟ .....اخلاص بنیاد ہے اور بنیاد جب خراب ہو کسی عمارت کی، وہ عمارت کبھی سیدھی ہو نہیں سکتی وہ ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔

حضرت بنوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ بھئی ''اگر کسی نے مدرسہ دنیا کے لئے بنایا تو آخرت کا سب سے بڑا عذاب ہوگا''۔ دیکھو نا لوگ ہمارے ساتھ کتنا تعاون کر رہے ہیں، اپنا مال دے رہے ہیں، اپنے جگر گوشے ہمارے حوالے کر رہے ہیں اور ہم اس کو نام ونمود کے لئے بنائیں، شہرت کے لئے بنائیں یا کوئی اور مقصد ہو تو پھر ظاہر بات ہے ہمارا گریبان ہوگا قیامت کے دن اور اِن لوگوں کا ہاتھ ہوگا۔ ہماری گردن ہوگی اُن کے پاؤں ہوں گے۔ یہ ہماری گرفت کا باعث بنے گا۔ ''لیکن مدرسہ اگر کسی نے بنایا ہے آخرت کے لئے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے تو پھر یہ دنیا میں عذاب ہے'' دنیا میں اس کے لئے مشکلات ہیں۔ اب مشکلات کیا ہیں...؟

مہتمم جب سوچے گا کہ یہ قوم کی امانتیں میرے پاس ہیں، لوگوں نے مجھے مکلّف بنادیا ہے، امین بنادیا ہے تاکہ میں اِن کی امانتوں کو صحیح مصرف میں خرچ کروں، وہ پھونک پھونک کر قدم رکھے گا۔ وہ سوچے گا کہ آیا یہ کام جو میں کررہا ہوں، مدرسے کا یہ مال جو میں خرچ کررہا ہوں، جس شعبے میں خرچ کررہا ہوں آیا یہ صحیح بھی ہے یا نہیں؟..... حضرت مفتی احمد الرحمٰن صاحبؒ فرماتے تھے کہ حضرت بنوریؒ کے ساتھ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مدرسہ کے اندر بیٹھے ہوئے تھے تو اِن کے پاس کوئی مہمان آیا اُن کو لکھنے کی ضرورت پڑی تو انہوں نے وہاں سے کاغذ اٹھایا وہ کاغذ مدرسے کا تھا۔ اب وہ مہمان بھی بڑے قابلِ احترام۔ حضرت بنوریؒ نے اُن سے وہ کاغذ لے لیا کہ جناب یہ مدرسے کا کاغذ ہے، مدرسے کے استعمال کے لئے ہے یہ ذاتی استعمال کے لئے نہیں۔ کتنا مشکل ہوتا ہے مہمان کے سامنے یہ کہنا، لیکن جن حضرات کے دلوں میں آخرت کا خوف ہوتا ہے وہ ان چیزوں کا خیال رکھتے ہیں۔

دوسری چیز: مخلص رفقاء:..... ایک مثالی اور اچھے مدرسے کے لئے یہ بات بڑی ضروری ہے کہ اُس مہتمم کو، اُس دینی ادارے کے سربراہ کو اچھے ساتھی میسر آجائیں۔ مخلص رفیق، محنتی اساتذہ میسر آجائیں۔ ایسے اساتذہ ہوں کہ وہ تدریس کے میدان میں آرہے ہوں بس اُن کا مقصد تدریس ہو۔ تدریس کو وہ ایک عبادت سمجھ کر کے آئیں، ایک چیلنج سمجھ کر آئیں۔ اِس میدان میں آنا اُن کی کوئی مجبوری نہ ہو۔ انہوں نے اِس پیشے کو بڑی عبادت سمجھ کر اختیار کیا ہو، یہ معمولی کام نہیں یہ بہت بڑا کام ہے۔ اگر اِس مہتمم کو ایسے اچھے اساتذہ، محنتی اساتذہ، انتھک اساتذہ اور جذبے اور محنت کے ساتھ کام کرنے والے ساتھی مل جائیں یہ اس مدرسے کی بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ اور اس کے لئے ظاہر بات ہے کہ مہتمم صاحب کو اچھے ساتھیوں کے انتخاب کی کوشش کرنی چاہیے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے مانگنا بھی چاہئے اے اللہ! اِس مدرسے کو چلانے کے لئے، اِس دینی ادارے کو چلانے کے لئے مجھے اچھے اساتذہ اور محنتی اساتذہ عطا فرما۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مہتمم اللہ کے سامنے جھولی پھیلاتا ہے، اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ اللہ ضرور دستگیری فرمائیں گے اور اس کو ایسے ساتھی عطا فرمائیں گے۔

مخلص رفقاء ناگزیر ہوتے ہیں:..... دیکھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد بھی ہوتی ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے کارِ نبوت اُن کے حوالے کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ ﴿واجعل لی وزیراً من اهلی هارون اخی اشدد به ازری واشرکه فی امری﴾ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ دین کے کام میں ایک اچھے ساتھی کا مل جانا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اہل علم کے لیے صرف اشارہ ہی کافی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے لئے مکی دور میں کتنی مشکلات تھیں اور ان مشکلات میں رسول اللہ ﷺ دعا مانگ رہے ہیں **اللهم اعزّ الاسلام بعمر بن الخطاب أو بعمرو بن هشام** ۔ اے اللہ! اسلام کو تو عزت عطا فرما، یا تو عمر بن الخطاب کے ساتھ یا عمرو بن ہشام یعنی ابوجہل کے ساتھ۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے

اچھے ساتھی کی دعا کی ہے تو اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ دینی ادارے کے سربراہ کو ساتھیوں کے انتخاب میں اور ساتھیوں کے چناؤ اور مدرسین کے انتخاب میں بڑی کوشش کرنی چاہئے۔ اللہ سے مانگنا چاہئے۔

مولانا عبداللہ شہیدؒ کا رفقاء کے بارے میں فکرمند رہنا:..... حضرت مولانا عبداللہ شہیدؒ (بانی جامعہ فریدیہ و مہتمم) بڑے اللہ والے اور بڑے درویش تھے۔ ادارے کے لئے بڑی دعائیں دعا مانگا کرتے تھے اور یہ جو دینی ادارے ہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے مہتمم جھولی پھیلا کر رو کر مانگتا ہے، تب چلا کرتے ہیں۔ حضرت مولانا عبداللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اللہ کے سامنے بڑے روتے رہتے تھے۔ میں نے پہلے کراچی میں پڑھا پھر بنوری ٹاؤن میں پڑھاتا تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا تصور اور ذہن میں کبھی یہ نہیں آیا تھا کہ میں کراچی چھوڑوں گا، لیکن تقدیر اپنے اسباب خود بناتی ہے اللہ تعالیٰ کی شان ہے بس میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے مجھے کراچی سے آنے کا مشورہ دیا، ہمارے ایک ساتھی مفتی فاروق صاحب جو ایک سال پہلے یہاں (جامعہ فریدیہ) آگئے تھے انہوں نے مجھے ترغیب دی کہ آپ بھی آجائیں چچا نے بھی کہہ دیا تو فوراً میرا ذہن بدل گیا حالانکہ اُس وقت حالات بھی کراچی کے خراب نہیں تھے، مفتی فاروق صاحب نے جب کہا کہ آپ ادھر آجائیں یہاں ضرورت بھی ہے ساتھیوں کی۔ تو مجھے یاد ہے جب میں آیا تو حضرت (مولانا عبداللہ شہیدؒ) وہاں گیٹ کے سامنے دفترِ محاسب سے نکل رہے تھے مفتی فاروق صاحب نے میرا تعارف کروایا بڑے خوش ہوئے اور فوراً مجھے ملے اور فرمایا ''بس! بس! ہماری دعا قبول ہوگئی ہماری دعا قبول ہوگئی'' تو مطلب صرف یہ ہے کہ حضرت اللہ سے دعا مانگا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اچھے ساتھی عطا فرمائیں مخلص رفیق عطا فرمائیں اور محنتی مدرسین عطا فرمائیں۔

مشہور مدرس کا لانا مدرسے کی کامیابی نہیں، ناکامی ہے:..... بڑی معذرت کے ساتھ، کہ یہ مدرسے کی کامیابی نہیں ہے کہ کوئی مہتمم بڑے مشہور مدرسین کو چن چن کر لے آئے کہ فلاں بڑا مشہور مدرس ہے اس کے ساتھ اتنے طالب علم ہوتے ہیں، یہ مدرسے کی کامیابی نہیں ہے بلکہ یہ مدرسے کی ناکامی ہے۔ کیونکہ اگر ایسے مدرسین مدرسہ کے اندر آئیں گے اُن کے کام کرنے کا اپنا مزاج ہوگا، کام کرنے کی اپنی ترتیب ہوگی، وہ مہتمم کو اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ وہ مطالبات کرے گا، فرمائشیں ہوں گی۔ اگر مہتمم نے ان کے مطالبات پورے کئے، فرمائشیں پوری ہوتی رہیں تو بہت اچھا۔ لیکن اگر جونہی مہتمم نے کوئی مطالبہ پورا نہیں کیا، کوئی فرمائش پوری نہیں ہوئی یا یہ کہ کسی اور مدرسے نے زیادہ تنخواہ کی پیش کش کردی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مدرس دوسرے مدرسے میں چلا جائے گا اور اس کے ساتھ آنے والے طلبہ بھی دوسرے مدرسہ میں چلے جائیں گے تو اپنے ساتھ وہ پورا مدرسہ لے کر جائے گا۔ وہ مدرسہ خالی ہو جائے گا تو کسی مشہور مدرس کے آنے سے اس مدرسے میں استحکام نہیں آئے گا مدرسے کا نظم و نسق مثالی نہیں ہوگا۔ اس لئے مہتمم کے ذمے جو دوسری چیز ہے وہ اللہ سے مانگنا کہ اے اللہ! ہمیں مخلص رفیق عطا فرما۔ اگر مخلص رفقاء مہتمم کو مل جائیں یہ انشاء اللہ مدرسے کی کامیابی ہے، اس سے مدرسہ

ترقی کرے گا۔

تیسری چیز: اساتذہ کے ساتھ رویہ:.....جس مہتمم کو اچھے ساتھی اور اچھے مدرسین مل جائیں تو مہتمم کا رویہ اُن مدرسین کے ساتھ بڑا کھلا ہو۔ برادرانہ رویہ ہو، حاکمانہ نہ ہو۔ کہیں مہتمم یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ میں مہتمم ہوں اور یہ میرے ماتحت ہیں میرے ملازم ہیں۔ اگر مہتمم نے اِن مدرسین کو ملازم سمجھ لیا کہ یہ میرے ملازم ہیں تو مدرسہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔ مہتمم کو چاہئے کہ ان کو اپنا ساتھی، اپنا معاون اور اپنا مددگار سمجھے ہمارے سامنے تو رسول اللہ ﷺ، حضرات صحابہ کرامؓ اور حضرات خلفاء راشدینؓ کی مثال ہونی چاہئے۔ انہوں نے اپنے ماتحتوں اور ساتھیوں کے ساتھ کتنا بے تکلفانہ اور برادرانہ رویہ رکھا۔ کبھی اُنہوں نے اپنے اور ماتحتوں کے درمیان فاصلے نہیں رکھے۔

مدرسین اور ملازمین کی عزتِ نفس کا خیال رکھنا چاہئے:.....اِن مدرسین اور ملازمین کی بھی عزت نفس ہوتی ہے۔ اگر مہتمم ادارہ نے اِن ملازمین کو اور ان مدرسین کو اپنا ملازم سمجھ لیا اور تکبر والا اور حاکمانہ رویہ ان کے ساتھ اختیار کیا تو ان کے دل ٹوٹ جائیں گے اور وہ دل سے کبھی کام نہیں کریں گے۔ لیکن اگر ان کو اپنا بھائی، اپنا مددگار سمجھے اور ان کو ساتھ لے کر کے چلے تو ان شاء اللہ وہ اپنے دل سے کام کریں گے۔ مہتمم اِن مدرسین کو عزت دے گا اور ان کی عزتِ نفس کا خیال رکھے گا تو یہ مدرسین بڑے اخلاص اور بڑی جانفشانی کے ساتھ کام کریں گے اور دن رات ایک کر کے اس مدرسے کی ترقی کے لئے کام کریں گے۔

چوتھی چیز: آپس کی مشاورت:.....آپس کی مشاورت ایک ایسی صفت ہے جس سے مدرسہ ترقی کرتا ہے اور مدرسے کا نظم ونسق بہتر ہوتا ہے۔ مدرسے کے اہم کاموں میں اپنے مدرسین کو مشاورت میں شریک کرے۔ کسی بھی اہم کام میں جب مشورہ کیا جاتا ہے تو اس کام کے جتنے پہلو ہوتے ہیں وہ سامنے آجاتے ہیں۔ اگر زیادہ مدرسین ہیں، تو ان میں سے چیدہ چیدہ حضرات کی شوریٰ قائم کرلیں۔ اگر کوئی اہم معاملہ ہو تو اس میں سارے مدرسین کو شامل کریں اور وہ معاملہ اُن کے سامنے رکھے اور ان سے بھی مشورہ طلب کرے تو اس میں مزید خیر ہوگی اور مشورہ لیتے وقت بہتر یہ ہے کہ جس طرح ہماری تبلیغی جماعت کے حضرات مشورے کے لئے بیٹھتے ہیں تو ایک ساتھی مشورہ کے آداب بیان کر دیتا ہے، مثلاً: یہ کہ بھئی جو ساتھی بھی رائے دے باقی ساتھی اس کو غور سے سنیں اور اجتماعی مفاد کو سامنے رکھ کر رائے دی جائے کسی کی تردید نہ کی جائے، اپنے ذاتی مفادات کو سامنے رکھ کر مشورہ نہ دیا جائے۔ اسی طرح ایک مدرس مشورہ کے آداب بیان کر دیا کرے، جب مشورے کے آداب بیان ہوں گے تو سب کے سامنے مشورہ کی حقیقت، اہمیت اور ضرورت واضح ہو جائے گی تو ہر ساتھی مدرسہ کے اجتماعی مفاد کو سامنے رکھ کر اخلاص کے ساتھ مشورہ دے گا تو اس میں ضرور خیر اور برکت آئے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اخلاص کے ساتھ وہ بیٹھیں گے، اللہ رب العالمین ضرور اخلاص کی برکت سے کوئی نہ کوئی اچھی بات کسی کے دل میں ڈال دیں گے اور جب مجموعی آراء سامنے آئیں گی تو پھر اللہ تعالیٰ اس مہتمم اور اس منتظم کے دل میں

اچھی بات ڈال دیں گے ان شاء اللہ، صحیح فیصلہ تک پہنچنے میں یہ چیز بڑی معاون ہوتی ہے، بڑی مددگار ہوتی ہے۔ اس میں غلطی کا امکان کم سے کم ہوتا ہے۔

مشورہ حضور ﷺ اور صحابہؓ کی سنت ہے: .....مشورہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور دیگر اہم صحابہؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ مشورہ کیا کرتے تھے۔ حضرات خلفاء راشدین کی سنت بھی یہی تھی اور قرآن کا حکم بھی یہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ صاحبِ وحی ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی بھی آتی ہے، جس میں کسی قسم کی غلطی کا امکان نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہیں: ﴿وشاورھم فی الامر﴾ اپنے ساتھیوں کو مشورے میں شریک کیا کریں۔ یہ ہماری تعلیم کے لئے ہے کہ ہم بھی اپنے کام مشورے سے کیا کریں۔ قرآن میں دوسری جگہ اللہ تعالیٰ اپنے ایمان والے، اپنے اچھے بندوں کی مدح بیان فرماتے ہیں تو ان کی ایک صفت یہ بھی بیان فرماتے ہیں: ﴿والذین استجابوا لربھم واقاموا الصلوٰۃ وامرھم شوریٰ بینھم﴾ ان کے کام آپس کے مشورے کے ساتھ ہوتے ہیں۔

یہ دین کا کام، تعلیم کا کام، تدریس کا کام یہ بھی بڑا اہم کام ہے۔ مہتمم اور سربراہ ادارہ کو چاہئے کہ معاملہ فہم اور تجربہ کار رفقاء کی شوریٰ بنائیں، اس شوریٰ کے مشوروں سے جو فیصلے ہوں گے ان برکات اور خیر آپ کو کھلی آنکھوں نظر آئیں گی۔

پانچویں چیز: تقسیم کار اور دوسروں کے کام میں عدم مداخلت:.....تقسیم کار کا لحاظ اور خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ادارہ ہے، وہاں کئی قسم قسم کی ضروریات ہیں، کئی شعبہ جات اور کئی کام ہیں۔ ادارہ میں سارے کام ایک فرد تو نہیں کرسکتا۔ اس لئے ادارے کے کام کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے مہتمم کو چاہیے کہ مدرسین کے ذوق کی مناسبت سے کام تقسیم کردے۔ مالیات کا نظام ایک ساتھی کے حوالہ کردیا۔ تعمیرات کا کام دوسرے ساتھی کے حوالے کر دیا۔ مطبخ، مطعم کا نظام ایک ساتھی کے حوالہ کردیا۔ تعلیم کے کام کی نگرانی کسی دوسرے ساتھی کے حوالے کردی۔ یہ ہے تقسیم کار، پھر مہتمم کو چاہئے کہ جس کے حوالے جو بھی کام کررہا ہے اس کو پھر اختیار بھی دے اور اختیار کی حدود بھی متعین کردے کہ آپ نے اس حد تک جانا ہے، بالخصوص ناظم کے اختیارات کی حدود۔ ناظم نے کیا کرنا ہے، طلباء کے کون کون سے امور اُن سے متعلق ہوں گے، اساتذہ، مدرسین کے کون کون سے امور اُن سے متعلق ہوں گے۔ ساری چیزیں طے کرکے ان کو اختیار دے پھر اس میں مداخلت نہ کرے۔ البتہ کام کی نگرانی کرتا رہے اور ضرورت کے وقت مناسب طریقے سے ان کو مشورہ دیتا رہے۔ اسی طرح ناظم دارالاقامہ، ناظم مطبخ اور دیگر شعبوں کے جتنے ناظمین متعین ہوں ان کے کام اور اختیار کی حدود متعین ہوں اور پھر اپنے اپنے شعبوں میں انہیں اختیار دیئے جائیں اور ان کے کام میں مداخلت نہ کی جائے تاکہ وہ خود اعتمادی سے کام کرسکیں۔

ایک مثال:.....دیکھیں، آپ نے کسی کو گھوڑے پر بٹھایا ہے تو گھوڑے کی لگام بھی اس کے ہاتھ میں دیں کہ وہ

گھوڑے کو کس طرح چلاتا ہے، لیکن آپ نے کسی کو گھوڑے پر بٹھایا کہ بھئی گھوڑا چلاؤ، گھوڑے کو دوڑاؤ، لیکن گھوڑے کی لگام آپ اپنے ہاتھ میں رکھیں تو کیا وہ گھوڑے کو دوڑا سکے گا....؟ کبھی نہیں دوڑا سکتا۔ مہتمم کو چاہئے کہ جب کسی کو نظامت کے گھوڑے پر بٹھایا ہے تو اس کی لگام بھی اس کے ہاتھ میں دے، پھر اس کی صلاحیتیں دیکھیں، یہ بڑی بات ہوگی۔

مہتمم ناظمین کے امور میں مداخلت نہ کرے:..... ہمارے علماء کرام ماشاء اللہ بڑی صلاحیتوں والے ہوتے ہیں لیکن اہم چیز خود اعتمادی ہے، ان کو اعتماد دیا جائے کہ یہ کام آپ نے خود کرنا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً یہ ہوتا ہے کہ کسی کو کوئی ذمہ داری جاتی ہے تو اس میں مداخلت کی جاتی ہے، اختیارات نہیں دیے جاتے، مثلاً: مہتمم صاحب نے ایک کو ناظم بنا دیا، ناظم بنانے کے بعد پھر اُس کے امور میں مداخلت ہوتی ہے، مثلاً ایک طالب علم ہے وہ چھٹی پر گیا ہوا ہے، کس نے چھٹی دی ہے، معلوم ہوا کہ مہتمم صاحب نے دی ہے اور ناظم کو پتہ ہی نہیں۔ کئی حضرات ایسے ہوتے ہیں وہ بے چارے دل میں یہ سوچتے ہیں کہ اگر انہوں نے یہ کام کرنا تھا تو پھر مجھے کیوں ذمہ دار بنایا۔ اس سے ان کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، اس سے اُس ناظم کا دل ٹوٹتا ہے، وہ خود اعتمادی کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ اس لئے سربراہ ادارہ کو چاہئے کہ تقسیم کار کرے اور اس کے ساتھ ساتھ پھر اختیارات دے اور پھر اختیارات کی حدود متعین کرے اور پھر اس میں مداخلت نہ کرے۔

ناظمین کی ذمہ داری:..... اسی طرح جو ناظمین حضرات ہیں، یا کسی شعبے کے ذمہ دار ہیں، ان کو بھی چاہئے کہ جو اختیارات ان کو دیئے گئے ہیں، بس وہی اختیارات استعمال کریں، اپنی حدود میں رہیں، حد سے باہر نہ جائیں کہ اس حد تک یہ میرا کام ہے اور یہ مہتمم صاحب کا کام ہے۔ مہتمم کے کام اپنے ہاتھ میں نہ لیں، مہتمم کی ذمہ داریوں کو نہ نبھائیں۔ الّا یہ کہ مہتمم اگر کہے تو پھر الگ بات ہے، لیکن ایسا نہ ہو کہ مہتمم کی اجازت کے بغیر جو مہتمم کے کام ہیں وہ بھی کر رہے ہیں۔ نظام اس سے خراب ہوتا ہے، آپس کے اختلاف وانتشار اس سے ہی بڑھتے ہیں۔ ایک گھر آپ دیکھ لیں، ایک گھر میں چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ بیٹا بھی ہوتا ہے باپ بھی ہوتا ہے اگر گھر کے اندر باپ والے اختیار بیٹا استعمال کرنا شروع کر دے تو پھر اختلاف وانتشار ہوگا اور معاملہ خراب ہو جائے گا۔ ہر ایک اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر کے، حدود میں رہ کر کے اپنا کام کرے گا تو وہ ادارہ ان شاء اللہ ترقی کرے گا۔ وہ ادارہ اچھا ادارہ بنے گا، مثالی ادارہ بنے گا۔

چھٹی چیز: مدرسین کی ضروریات اور اُن کی تنخواہوں کا معقول انتظام:..... ظاہر بات ہے کہ اِن مدرسین کی بھی ضروریات ہیں، ملازمین کی بھی ضروریات ہیں۔ تو مہتمم ادارہ کو چاہئے کہ ان مدرسین کی ضروریات کا بھی انتظام کرے۔ جو ایک مناسب تنخواہ ہے وہ ان کو دے۔ ہمارے مدارس کے اس ماحول میں مدرسین کی بہت تھوڑی تھوڑی تنخواہیں ہیں، الا نادراً یہ ان مدرسین کی بڑی قربانی ہے اور اس دور میں دنیا والے اگر ان کو دیکھیں تو وہ حیران ہوں گے، ہمارے مدارس کے مدرسین، مساجد کے ائمہ اس مہنگائی کے دور میں بھی بہت ہی قلیل مشاہرے پر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں دنیوی اداروں کے ملازمین اور گورنمنٹ ملازمین کی تنخواہیں زیادہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے خزانوں پر نظر رکھیں:.....میں بڑے ادب اور بڑی معذرت کے ساتھ مہتممین حضرات سے عرض کروں گا کہ اللہ تعالیٰ کے خزانوں پر نظر رکھیں یہ مدارس اللہ تعالیٰ ہی چلا رہے ہیں۔ مدارس چلانا اگر اُن کے بس کی بات ہوتی تو مشکل ہو جاتا، جیسے مولانا عبدالعزیز صاحب کہا کرتے ہیں: ''ہمارے بس کی بات ہوتی تو ہم ایک دن بھی مدرسہ نہ چلا سکتے''.....اللہ تعالیٰ چلانے والے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے خزانوں پر نظر رکھیں، رازق اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ مہتمم ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ مدرسین کو مناسب تنخواہ دیں گے اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ ضرور اس کا بندوبست فرمائیں گے۔

برصغیر ہندوپاک کے جتنے بھی دینی مدارس اور دینی ادارے ہیں ان میں کوئی بھی دینی ادارہ ایسا نہیں ہے کہ بھرپور وسائل اُن کے پاس ہوں۔ ہمارے یہ دینی ادارے دنیوی اداروں سے بالکل مختلف ہیں۔ دنیا والے تو پہلے وسائل جمع کرتے ہیں، وسائل آنے کے بعد وسائل کے اعتبار سے کام کرتے ہیں، لیکن ہمارے ان دینی مدارس میں اس طرح نہیں ہوتا، ہمارے ہاں تو پہلے کام ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کام کے اعتبار سے وسائل دیتے ہیں یعنی ہمارے ہاں پہلے طلباء ہوتے ہیں، جتنے طلباء ہوں گے، جتنے مدرسین ہوں گے اللہ تعالیٰ ان کے مطابق وسائل بھی دیں گے اور ان شاء اللہ کام بھی ہوتا رہے گا۔

وسائل کی کمی سے مدرسہ کبھی بند نہیں ہوگا:.....اگر ہم اللہ کے لئے کام کر رہے ہیں تو واللہ یہ مدارس کبھی وسائل کی کمی کی وجہ سے بند نہیں ہوں گے۔ ہماری کسی غلطی یا جرم کی وجہ سے تو مدرسہ بند ہو سکتا ہے لیکن وسائل نہ ہونے کی وجہ سے، مال نہ ہونے کی وجہ سے مدرسہ بند ہو جائے ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اس لئے مہتممین حضرات کو ذرا فراخدلی کا مظاہرہ کرنا چاہئے اور مدرسہ میں کام کرنے والے جتنے ملازمین اور جتنے بھی مدرسین ہیں ان کی ضروریات کا ایک معقول انتظام کرنا چاہیے۔ ان شاء اللہ، اللہ رب العالمین اپنے خزانوں سے ضرور دیں گے۔

ادارے کی ترقی کے لئے کارکنان کی یکسوئی:.....مدرسین کو جب یہ سہولتیں دیں گے تو ان کو دلجمعی حاصل ہوگی، سکون ہوگا، یکسوئی ہوگی پھر یہ ادارے ترقی کریں گے۔ جب تک کسی مدرس کو آپ یکسوئی نہیں دیتے، دلجمعی نہیں دیتے، اُس بے چارے کے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے تو کیا وہ آئے گا صبح پڑھانے کے لئے.....؟ بالفرض اگر آیا بھی تو وہ تھوڑی دیر کے لئے آئے گا اپنا ٹائم پورا کر کے معاش کی تلاش میں جائے گا۔ کوئی دوکان کھولے گا، کوئی ریڑھی لگائے گا، یا جا کر کوئی اور کام کرے گا۔ یہ بھی انسان ہے اس کے ساتھ بھی کنبہ ہے، خاندان ہے، بیوی بچے ہیں، اُن کو گھاس تو نہیں کھلا سکتا۔

مدرس کے قلیل مشاہرہ میں برکت ہوتی ہے:.....لیکن اتنی بات تو ماننی پڑے گی کہ تنخواہ جتنی بھی ہو، مدرس کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل رہا ہے، اگر تدریس یا دینی خدمت اللہ تعالیٰ کے لئے کر رہا ہے، یقیناً اُس میں خیر و برکت ہوگی۔ اور یہ ہمارا تجربہ ہے، مدرسین حضرات کے تجربے اور علم میں یہ بات ہوگی کہ مدرسے کا جو تھوڑا سا مشاہرہ ہوتا ہے، اللہ رب

العالمین اُس میں بھی بڑی برکت ڈال دیتے ہیں۔ ہم خود دیکھتے ہیں اللہ رب العالمین نے مدرسہ کے مشاہرہ میں بڑی برکت رکھی ہے اس تھوڑی رقم سے اللہ تعالیٰ ساری ضروریات بھی پوری کر دیتے ہیں اور اسی قلیل رقم میں اللہ رب العالمین ہمارے احباب کو حج وعمرہ بھی نصیب فرماتے ہیں۔

برکت کا ایک واقعہ:.....ایبٹ آباد کالج میں ہمارے ایک شاگرد پروفیسر ہیں۔ ایک بار ازخود کہنے لگے کہ استاد جی اس وقت کالج سے مجھے چالیس ہزار سے زائد تنخوہ مل رہی ہے لیکن مہینہ پورا نہیں ہوتا کہ وہ پیسے ختم ہو جاتے ہیں، جبکہ اس سے پہلے میں ایک مدرسے میں پڑھاتا تھا۔ اس میں چار پانچ ہزار میری تنخواہ تھی، بڑے اطمینان سے، سکون سے میں کام کر رہا تھا۔

مدرس زیادہ تنخواہ کا مطالبہ نہ کرے:.....مدرس اگر اللہ تعالیٰ کے لئے پڑھا رہا ہے اور اُس کی نظر اللہ تعالیٰ کے خزانوں پر ہے وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا رازق سمجھتا ہے۔ "ومامن دابّة فی الارض الا علی الله رزقها" پر اُس کا ایمان اور یقین ہے اس کو بھی چاہئے کہ تنخواہ بڑھانے کے مطالبے نہ کرے۔ اگر ادارہ بڑھا دے تو بہت اچھا ہے۔ نہیں بڑھاتا تو یہی سمجھے کہ میں مہتمم کے لئے نہیں پڑھاتا ہوں، میں اللہ کے لئے پڑھا رہا ہوں، وہی میری کفالت کرے گا۔

قاری رحیم بخش صاحبؒ کا واقعہ:.....قاری رحیم بخش صاحبؒ کا واقعہ ہے۔ بہت پُرانی بات ہے، خیر المدارس کے ابتدائی زمانے کی، جب مولانا خیر محمد صاحبؒ مدرسے کے مہتمم تھے۔ اُس وقت بھی بڑی بڑی تنخواہیں نہیں تھیں۔ مدرسین کی تنخواہیں کم تھیں تو سب مدرسین نے مل کر کے تنخواہ میں اضافے کی درخواست دی اور یہ کہا کہ اگر ہماری تنخواہیں نہیں بڑھائیں گے تو ہم کلاس میں بھی نہیں جائیں گے تو قاری صاحبؒ نے بھی دستخط کر دیئے۔ درخواست مولانا خیر محمد صاحبؒ کی خدمت میں پیش ہوئی۔ انہوں نے تنخواہ نہیں بڑھائی اور کسی وجہ سے درخواست رد کر دی۔ صبح مدرسین نے اتفاق کیا کہ ہم کلاس میں بھی نہیں جائیں گے۔ اسی دوران قاری رحیم بخش صاحبؒ آئے اور کلاس کی طرف جانے لگے تو مدرسین اُن کے پاس گئے کہ حضرت! کلاس میں نہیں جانا۔ حضرت نے فرمایا کیوں؟ کہنے لگے ہماری درخواست رد کر دی گئی۔ کہنے لگے "درخواست رد کر دی، کوئی بات نہیں ہم کوئی "خیر محمد" کے لئے تھوڑا ہی پڑھا رہے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے لئے پڑھا رہے ہیں۔ یہ طلباء دین کے لئے نکلے ہوئے ہیں، یہ طلباءِ دین ہمارے انتظار میں ہیں، ایسا نہیں ہوسکتا کہ طلباء بیٹھے ہوئے ہوں، کلاسیں لگی ہوئی ہوں اور ہم کلاس کے اندر نہ جائیں" بس اسی سے وہ سارا اتفاق ٹوٹ گیا اور دوسرے مدرسین بھی کلاسوں میں چلے گئے۔

.....(جاری ہے).....

☆.....☆.....☆

تجوید کی اہمیت.....اکابر کی نظر میں

قاری محمد تقی الاسلام دہلوی

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے زمانہ میں ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، وہاں دیکھا کہ عربوں کی نظر میں ہندوستانی علماء کی کوئی وقعت نہیں، انھیں گری نظر سے دیکھتے ہیں، جس کی وجہ یہ تھی کہ ہندی علماء قرآن کریم غلط پڑھتے ہیں اور مدارسِ عربیہ میں تجوید کا کوئی اہتمام نہیں، جب کہ تجوید کی فرضیت قرآن وحدیث اور اجماع امت سے ثابت ہے اور کسی نے اس کا انکار نہیں کیا، مگر شعبۂ کتب کے طلباء تجوید کو فضول سمجھتے ہیں، بعض بڑے اساتذہ بھی کہتے ہیں: ''علم سیکھو، تجوید میں کیا رکھا ہے؟'' اور وعظوں میں کچھ اور ہی رنگ ہوتا ہے۔

مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کا آغاز:.....حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے پہلا کام یہ کیا کہ حرمِ مکی میں مدرسہ قائم کیا اور ہندوستانی بچوں کو جمع کر کے پڑھانا شروع کیا۔ اسی زمانہ میں قاری عبدالقادر مدراسی، فاضل جامعہ ازہر مصر سے فراغت کے بعد مکہ مکرمہ تشریف لائے، یہ علم وفن کے باکمال قاری تھے، حضرت مہتمم صاحب نے انھیں اپنے ہاں مدرس رکھ لیا۔

مدرسہ صولتیہ کی تعمیر:.....حضرت مہتمم صاحب کی ترغیب پر بنگال کی ایک خاتون ''صولت النساء'' نے اپنا سارا سرمایہ اسی مدرسے کی تعمیر پر لگا دیا، ''مدرسہ صولتیہ'' اسی کے نام پر ہے۔ ''قاری عبدالقادری مدراسی'' کی ہر وقت کی محنت اور لگن نے مدرسہ کو چار چاند لگا دیئے، خلوص وللّٰہیت کے جذبے نے بچوں کا تلفظ اور لہجہ ایسا قابل تعریف بنا دیا کہ عرب بھی شوق سے سنتے۔ حضرت مہتمم صاحب کی فکر سلیم نے حقارت ونفرت والے ماحول کو الفت ومودت سے بدل دیا، جب مدرسہ کے جلسے میں ہندوستانی بچے تلاوت کر رہے تھے تو عرب بھی جھوم رہے تھے۔

قاری عبداللہ مکیؒ کی آمد:.....انقلابِ دہلی کے بعد آپؒ کے تایا جان خاندان کے چھوٹے بڑے سترہ افراد کو لے کر مکہ مکرمہ پہنچے، مدرسہ کے متصل رباطِ برما میں پورے خاندان کو سکونت کی اجازت مل گئی۔ اس وقت آپؒ کی عمر چار پانچ

سال تھی۔ قاری صاحبؒ کے تایا جان کا تین سال بعد انتقال ہوگیا۔ آپؒ کے والد محمد بشیر خان مرحوم اور حضرت مہتمم صاحب کا خوب جوڑ ملا۔ آپ کے والد صاحب جلد سازی کے بہترین کاریگر تھے، مہتمم صاحب کی کوشش سے کام کرنے کی قانونی اجازت مل گئی، کام خوب چمکا۔ آپ نے تینوں بچے (قاری عبداللہ، قاری عبدالرحمٰن (مؤلف فوائد مکیہ) اور قاری حبیب الرحمٰن) مہتمم صاحب کے حوالے کردیئے۔ آپ نے ان کا پورا پورا خیال رکھا اور اعلیٰ درجہ کی کامیابی سے آراستہ کیا۔ ''قاری عبدالقادر مدراسی'' نے بھی شوق ومحنت سے پڑھایا اور کوئی لہجہ نہیں چھوڑا جو قاری عبداللہ صاحبؒ کو نہ سکھایا ہو، آپؒ کو امام الفن بنادیا۔ آج کے دور میں شروع ہی سے لہجوں کی لگن لگ جاتی ہے، جس سے فن کا جنازہ نکل گیا۔ اب تو بعض علمی مراکز میں درسِ نظامی کے ساتھ ساتھ شاطبیہ تو پڑھا رہے ہیں، مگر مشق وحدر کی کوئی فکر نہیں، جس کی وجہ سے تجوید کے زمانہ میں جو تلفظ بنتا ہے وہ ضائع ہوجاتا ہے، پڑھنے والوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا، وہ خود کو عشرہ کا قاری سمجھتے ہیں۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون.**

آغازِ تدریس:.....حضرت قاری عبداللہ مکیؒ کو فراغت تعلیم کے بعد استاذ محترم کی سفارش پر حضرت مہتمم صاحب نے شعبۂ قرآن میں معین مدرس رکھا، آپ نے بچوں پر خوب محنت کی، آپؒ بھی استاذ کی طرح انتھک محنت کرتے تھے۔ حضرت قاری عبداللہ مکیؒ کی مدرسہ سے محبت کا یہ حال تھا کہ آپؒ دنیا کی بڑی بڑی دعوتوں پر بھی کہیں پڑھانے نہیں گئے اور ابتدا سے لے کر آخر عمر تک یہیں پڑھایا اور منصب صدارت پر تجوید وقراءت کی چالیس سال خدمت کی اور امام الفن حضرت قاری عبدالمالک ان کے برادر کبیر حضرت قاری عبدالخالقؒ، استاذ الاساتذہ حضرت قاری عبدالرحمٰنؒ (مؤلف فوائد مکیہ) اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے علم وفن کے جامع لاتعداد اساتذہ تیار کیے۔ آپؒ جنت المعلیٰ (مکہ مکرمہ) میں خوابِ استراحت ہیں۔ **اللّٰھم اغفر لھم وارحھم.**

لمحہ فکریہ:.....اگر انتظامیہ کے نزدیک اس علم وفن کی اہمیت اور مدرّس کی جفاکشی کی قدر ہو تو مدرّس ہر صعوبت کو برداشت کرتا ہے اور اپنے لگائے ہوئے باغ کو اجاڑتا نہیں، خلاء اسی وقت ہوتا ہے جب مدرس بے بس ہوجائے اور جو مدرس اس مقدس کام کو ذریعۂ معاش سمجھتے ہیں وہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔

شیخ القراء ابراہیم سعد مصریؒ:.....آپ مکہ مکرمہ آئے تو مہتمم صاحب نے آپ کی خدمات حاصل کرلیں۔ آپ صاحب فضل وکمال اور علم وفن کے جامع تھے۔ آپؒ کے اور شیخ محمد المتولی (مؤلف: الوجوہ المسفرۃ) کے درمیان ''حسن بُدیر'' کا ایک واسطہ ہے

شیخ علی الضباع مصریؒ:.....آپ اپنے وقت کے شیخ القراء تھے۔ آپؒ کے اور شیخ محمد المتولی کے درمیان بھی ایک ہی واسطہ ہے۔ بندہ نے ۱۹۶۵ء میں پہلا سفر حج ایران اور عراق کے راستہ سے کیا، واپسی پر عراق کے صحراء میں قہوہ خانہ (ہوٹل) تھا، گاڑی ٹھہری، ریڈیو مصر سے تلاوت آرہی تھی، ایسی تلاوت کبھی نہیں سنی تھی، تجوید کا انتہائی بلند معیار، غضب

کی لطافت، ہجوں کی پختگی اور آواز کی گرفت نے حیرت زدہ کردیا، یہ تلاوت شیخ علی الضباغ کی تھی۔ اس سے شیخ ابراہیم سعدؒ کی فنی پرواز کا اندازہ ہوا، کیوں کہ دونوں ہم عصر تھے۔ خواب میں حضرت علی المرتضیٰؓ کی اذان سننے کا شرف نصیب ہوا، یہ اذان لطافت ونفاست میں شیخ علی الضباغ کی تلاوت سے بھی بہت آگے تھی، اسی جادو نے حضرت قاری عبداللہ مکیؒ کو منصب صدارت پر فائز ہوتے ہوئے بھی شیخ ابراہیم سعدؒ سے پڑھنے پر مجبور کیا۔ اس زمانے میں عزت وجاہ وغیرہ کوئی چیز نہ تھی، آپؒ اپنے شاگردوں کے سامنے شیخ ابراہیمؒ سے مشق کرتے حتی کہ قرآت کی بھی تجوید کی۔

حضرت قاری محمد شریفؒ:..... آپ مدرسہ تجوید والقرآن کے شعبۂ تجوید وقراءت کے صدر مدرس تھے، اس زمانہ میں مدرسہ کا معیارِ تعلیم قابل فخر تھا، نیز حضرت قاری صاحب مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ سے طیبہ کے طریق سے قراءت عشرہ کی سند قراءت لا چکے تھے، لیکن جب امام الفن حضرت قاری عبدالمالکؒ لاہو تشریف لائے تو حضرتؒ سے آپ نے قراءت سبعہ کی تجدید کی اور سند فراغت حاصل کی اور کسب فیض کا سلسلہ پانچ سال تک جاری رکھا۔ اس فن کی لطافت ونفاست کی کوئی حد نہیں۔ حضرتؒ کے ہاں جانا آنا آسان نہ تھا۔ حضرت قاری عبداللہ مکیؒ کا یومیہ معمول تھا کہ تدریس کے علاوہ ایک گھنٹہ تنہائی میں پوری توجہ سے مشق کرتے، فرماتے: ''اس کے بغیر حروف کی گرفت باقی نہیں رہتی''۔ آج کے دور میں یہ ہے انوکھی بات۔

اہم اصول:..... حضرت قاری عبداللہؒ نے اپنے ہونہار شاگرد مولانا اشرف علی تھانویؒ سے فرمایا: ''لہجے کی بالکل فکر نہ کریں، پوری توجہ حروف کی صحت کی طرف ہو اور اس پر محنت ہو، پھر جو ہی لہجہ بنے، مستحسن ہی ہوگا''۔

ارتقائی راز:..... حضرت قاری عبدالمالکؒ راوی ہیں کہ جمعرات کی رات کو مقابلہ حسنِ قراءۃ ہوتا، سب خوب سے خوب تر پڑھتے، آخر میں حضرت شیخ تبصرہ فرماتے، آئندہ مزید بہتری کی کوشش کرتے، یہ ہیں ارتقائی راز۔

ایک محفل کا واقعہ:..... حضرت قاری عبدالمالکؒ تلاوت کررہے تھے، محفل گرم تھی، حضرت قاری عبداللہ مکیؒ تشریف لائے اور باہر ہی بیٹھ گئے، تلاوت کے سرور میں جھومنے لگے، لیکن جب ملاقات ہوئی تو فرمایا: یہ کیا کیا؟ یہ کیا کیا؟ وغیرہ، یہی روک ٹوک ترقی کے راز ہیں، اب تو بڑے رہے نہیں، کون روک ٹوک کرے؟ **یا اسفیٰ ویا حسرتیٰ**۔

حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کو اس بات کا بہت صدمہ تھا کہ حجاز مقدس میں عرب، ہندوستانی علماء کو حقارت ونفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے، کیوں کہ انھیں قرآن پڑھنا نہیں آتا۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی فکر سلیم اور حضرت قاری عبداللہ مکیؒ کی محنت ولگن نے ہندوستانیوں کے سروں پر عزت ووقار کا تاج رکھ دیا۔ **فللّٰہ الحمد والمنۃ**۔

حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ نے حضرت تھانویؒ کو ۱۶ رجب ۱۳۱۰ھ کو خط لکھا کہ ہندوستانی علماء کو قرآن پڑھنا نہیں آتا، جس کی وجہ سے عرب حقارت ونفرت سے دیکھتے ہیں اور ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ

کیرانویؒ نے مدرسہ صولتیہ کے ابتدائی دور ہی میں تجوید کا اہتمام کیا، کیوں کہ علمِ تجوید کا رواج بہت کم ہوگیا ہے اور ہندوستان میں تو بہت ہی کم ہے، اب بفضل اللہ ''قاری عبدالقادر مدراسی'' کی انتھک محنت سے حقارت ونفرت کے بادل چھٹنے شروع ہوگئے ہیں۔ مدرسہ کے جلسہ میں ہندوستانی بچوں نے تلاوتیں کیں تو عرب بھی جھوم رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہندوستانی قراء جنھوں نے ''مدرسہ صولتیہ'' اوراس کی شاخوں سے تجوید وقراءت کی تکمیل کی اور دیگر علوم پڑھے اور کامل قاری بن کر نکلے، حرمین شریفین کے مدارس میں مدرس ہیں اور تعلیم یافتہ عرب اساتذہ تک کو تجوید پڑھا رہے ہیں اور کتنی خوشی کی بات ہے کہ ''شیخ عبداللہ خیاطؒ اسی ''مدرسہ صولتیہ'' کے فضلاء میں سے ہیں، عالم اور قاری تھے، آخر عمر تک حرم مکی کے خطیب رہے۔

یہ تو راقم تقی نے بھی دیکھا کہ ان کا خطبہ حالاتِ حاضرہ پر روشنی ڈالتا اور امت مسلمہ کی رہنمائی کرتا، کبھی انھوں نے کچی بات نہیں کی، انھی کے دور میں شیخ محمد السبیل امام مقرر ہوئے، مگر خطبہ شیخ خیاطؒ ہی دیتے تھے، یہ مدرسہ صولتیہ کے لیے کتنے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ اسی مدرسہ کے قاری مختلف جگہوں پر قاضی تھے۔ اس مدرسہ کا امتیازی نشان تجوید وقراءۃ ہے اور دوسرے علوم ثانوی درجہ میں تو تھے، مگر لزوم کے درجے میں حضرت قاری عبداللہ مکیؒ نے ''مدرسہ صولتیہ'' کو مرکز القراء بنادیا تھا۔ **فللّٰہ الحمد**۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو حضرت قاری عبداللہ مکیؒ کے لگائے ہوئے باغ، یعنی تجوید وقراءۃ کے طلباء کی تلاوتوں نے اتنا متاثر کیا کہ آپ ''فنِ تجوید کے لیے ٹھہر گئے، چنانچہ آپؒ نے پڑھنے میں ایسا کمال حاصل کیا کہ جب مدرسہ کی بالائی منزل میں مشق کرتے تو کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ حضرت قاری عبداللہ مکیؒ پڑھ رہے ہیں یا حضرت تھانویؒ۔ آپؒ نے تجوید ہی پر بس نہیں کی، بلکہ قراءت سبعہ کی بھی تکمیل کی اور مبتدی طلباء کے لیے پاؤ پارہ میں قراءت سبعہ کا اجرا لکھا، جس کا نام ''تنشیط الطبع'' ہے۔ حضرت تھانویؒ نے مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم سے متعلق تقریر کی، جس میں آپؒ نے شکایت کی کہ مدارس عربیہ میں تجوید وقراءت کا کوئی اہتمام نہیں ہے، جس کی وجہ سے عالم تو بن جاتے ہیں، مگر تجوید قرآن پڑھنا نہیں آتا۔ حضرتؒ کی اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۲۱ھ میں شعبۂ تجوید کا اجراء ہوا اور مظاہر العلوم میں بھی یہ شعبہ قائم ہوا۔ **بحمداللہ الکریم**۔

دکھی دل کی بات:..... راقم تقی نے اپنے ۵۷ سالہ دورِ تدریس میں دیکھا کہ شعبۂ کتب کے طلباء، بلکہ بعض بڑے اساتذہ تک بڑی حقارت ونفرت سے تجوید وقراءت کا استہزاء کرتے ہیں، **الامن رحم اللہ**، یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس جیسا بیکار اور فضول اور کوئی علم نہیں۔ الامان والحفیظ اگر مہتمم حضرات اور اساتذہ کرام طلباء کی ذہن سازی کریں اور نظامِ تعلیم میں تجوید کو باوقار مقام دیں تو اس کا رواج ہوسکتا ہے۔

تجوید کی اہمیت:..... قاری محبوب علی لکھنوی نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت قاری عبدالرحمٰن (مؤلف فوائد مکیہ) کو حکم دیا کہ ہندوستان جاکر کام کرو، آپؐ مکہ مکرمہ سے تشریف لائے اور تازندگی ہندوستان میں کام کیا۔

دوسرا واقعہ:.....حضرت مربی قاری فضل کریم صاحب (بانی وصدر مدرس مدرسہ تجوید القرآن، لاہور) کو نبی کریم ﷺ نے کچھ فرمایا، جس کا مفہوم تھا کہ: ''ہزارہ'' کی طرف توجہ کرو۔ آپؒ نے حضرت سیٹھ محمد یوسف صاحب کو بلایا، انھوں نے بھی یہی مفہوم لیا۔ یہ اپریل ۱۹۵۵ء کی بات ہے، یہ حضرات اسی دن کچھ طلباء اور کچھ مدرسین کو لے کر ایبٹ آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ ان حضرات کی فکر اور لگن سے لاتعداد بڑے بڑے مدرسین تیار ہوئے، جو پورے سعودیہ اور دیگر ملکوں میں قرآن کی قابل قدر خدمت کر رہے ہیں، اگر شریعت میں تجوید کی اہمیت نہ ہوتی تو نبی کریم ﷺ ان حضرات کو متوجہ نہ فرماتے۔

حضرت قاری عبداللہ مکیؒ کا اندازِ تلاوت:.....آپؒ کا اندازِ تلاوت خاص قسم کا تھا، جس میں ترعید، یعنی آواز کو نچانا اور تغنی یعنی بلاوجہ غنات کرنا اور تصنع، یعنی پڑھنے میں تکلف کرنا وغیرہ، یہ بیماریاں نہیں تھیں اور عربی لہجوں کا ان چیزوں سے کوئی تعلق نہیں، ان کی اپنی شان ہے۔ حضرت قاری عبداللہ مکیؒ کے دوست کی ''جدہ'' میں دکان تھی، جب کبھی تشریف لے جاتے تو دوست کے اصرار پر تلاوت کرتے، ایک مرتبہ اسی دکان پر تلاوت کر رہے تھے، تلاوت کیا تھی، جادو تھا کہ سننے والوں کا ہجوم تھا، ان میں ہندو بھی تھے، تلاوت ختم ہوئی تو ایک ہندو مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور قاری صاحبؒ سے کہا: ''مجھے مسلمان کیجیے، وہ تلاوت کی برکت سے مسلمان ہوا اور ابدی عذاب سے بچ گیا۔'' **فللّٰہ الحمد۔**

حضرت قاری عبداللہ مکیؒ باب العمرۃ میں نماز تراویح پڑھاتے تھے، شائقین کا ہجوم ہوتا تھا۔ آپؒ کے پیچھے مکہ مکرمہ کے علماء کرام، مدارس کے اساتذہ کرام، قاری صاحبان اور سرکاری عہدہ داران، حتی کہ شریفِ مکہ، یعنی گورنر تک تراویح پڑھتے تھے۔ تجوید وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولے۔

ایک وہ وقت تھا کہ قرآن غلط پڑھنے کی وجہ سے علماء ہند حقارت ونفرت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، جب قاری عبداللہ مکیؒ نے فن تجوید وقراءت میں امامت کا رتبہ پایا اور دن رات محنت کر کے ماحول بنایا تو مکہ مکرمہ کے شرفاء اور شائقین آپؒ ہی کے پیچھے تراویح پڑھتے، یہ شرف وکمال حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی فکر سلیم اور حضرت قاری عبداللہ مکیؒ کی شبانہ روز محنت اور دعاؤں کا غیر فانی نتیجہ ہے۔ رب کریم ان سب حضرات کو اپنا قرب اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ آمین یارب الکریم

بندہ راقم تقی نے اپنی شرعی ذمے داری کی بنا پر یہ چند الفاظ قلم بند کیے ہیں، اللہ کرے مدارس عربیہ میں تجوید وقراءت کا رواج ہو جائے۔ آمین

☆.....☆.....☆

مخدوم محمد ھاشم ٹھٹوی ؒ کی مطبوعہ تصانیف

تحقیق: ڈاکٹر محمد ادریس سومرو
ترجمہ: مولانا کلیم اللہ سندھی

[زیر نظر تحقیقی مضمون ڈاکٹر محمد ادریس سومرو کا تحریر کردہ ہے، جو انہوں نے سندھی زبان میں تحریر کیا ہے۔ مولانا کلیم اللہ سندھی نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے اور ساتھ کچھ مفید اضافات بھی کیے ہیں۔ معلوماتی اور افادیت سے پُر یہ مضمون قارئین وفاق کی خدمت میں پیش ہے.....ادارہ]

گرچہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ علماء سندھ میں کثیر التصانیف عالم مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی (متوفی ۱۱۷۴ھ) ہی ہیں۔ قدیم دور کے سندھ کے کوئی اور عالم اتنی تصانیف نہیں کر سکے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ مخدوم صاحب نے کتنی کتابیں تصنیف فرمائیں؟ اس کے متعلق مخدوم صاحب کا اپنا بیان، اپنی کتاب ''اتحاف الاکابر'' کے آخر میں اس طرح ہے۔ ''وھی الیوم علی مائة وخمسة عشر مؤلفا ''اور یہ میری تصانیف اس وقت ایک سو پندرہ سے متجاوز ہیں (۱) ''اس وقت'' کا مطلب کیا ہے؟ بظاہر اس سے مراد سال ۱۱۳۶ھ، کیونکہ یہ تصریح مخدوم صاحب نے ''اتحاف الاکابر'' میں تحریر کی ہے اور ''اتحاف الاکابر'' ۱۱۳۶ھ کی تالیف ہے، لیکن مخدوم صاحب نے ان تصانیف کی جو تفصیل اور جو نام ''اتحاف الاکابر'' میں ذکر کئے ہیں ان میں تو آپ کی وہ تصانیف بھی شامل ہیں جو ۱۱۳۶ھ کے بعد کی ہیں، حتی کہ ۱۱۷۲ھ تک کی تصنیف شدہ کتب بھی شامل ہیں۔ مثلاً

۱..... كشف الرين عن مسئلة رفع اليدين ، ۱۱٤۹ھ میں

۲..... التحفة المرغوبة فی افضلية الدعاء بعد المكتوبة، ۱۱٦۸ھ میں

۳..... بذل القوة فی حوادث سنی النبوة ۱۱٦٦ھ (۲)

۴..... حلاوة الفم بذكر جوامع الكلم ، ۱۱۷۱ھ میں

۵..... رفع الخفاء عن مسئلة الراء ، ۱۱۷۲ھ میں (۳)

جس سے معلوم ہوا کہ اصل کتاب ''اتحاف الاکابر'' اگرچہ ۱۱۳۶ھ میں تیار ہوکر مکمل ہوئی لیکن اس کا اختتامیہ جس میں مصنف نے اپنی تصانیف کا تذکرہ کیا ہے، وہ بعد کا لکھا ہوا ہے جس میں مخدوم صاحب وقتاً فوقتاً اضافہ کرتے رہے ہیں، یا یہ تصنیفات کی فہرست والا یہ حصہ، آخر عمر کے آخری ایام میں اصل کتاب میں شامل کیا ہے (یاد رہے کہ مخدوم صاحب کی وفات ۱۱۷۴ھ میں ہوئی ہے) اس لئے بعض سوانح نگاروں کا ''اتحاف الاکابر'' کے سال تصنیف کے لحاظ سے یہ کہنا کہ ''مخدوم صاحب ۱۱۳۶ھ تک ۱۰۰ کتابیں تصنیف کر چکے تھے (اس کے بعد ۱۱۷۴ھ تک ۳۸ سالوں میں نہ جانے مزید کتنی تصانیف کی ہوں گی!'' خلافِ حقیقت اور خلاف واقعہ ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اچھے خاصے محقق اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں۔

بہر حال، مخدوم محمد ہاشمؒ ''اتحاف الاکابر'' میں اپنی تصانیف کی تعداد ۱۱۵ سے متجاوز بتاتے ہیں، لیکن اس کے بعد آپ نے اپنی تصانیف کی جو فہرست پیش کی ہے، اتحاف الاکابر کے بعض قلمی نسخوں (۴) کے مطابق اس میں ۱۰۷ کتابیں ہیں، جن میں سے عربی میں ۷۵، فارسی میں ۲۲ اور سندھی میں ۱۰، البتہ اس کی کتاب کی فہرست کے آخر میں فرماتے ہیں کہ: ''ومنها غير ذلك'' (اسکے علاوہ اور بھی ہیں)، جس سے معلوم ہوا کہ مخدوم صاحب کا مقصد اپنی تصانیف کی مکمل فہرست پیش کرنا نہیں ہے۔

سندھ کے مشہور محقق اور مؤرخ پیر حسام الدین راشدی مرحوم نے مخدوم صاحب کی تصنیفات کی جو الفابیٹیکل فہرست ''تکملۃ الشعراء'' کے حاشیہ میں پیش کی ہے (۷) اس میں ۱۲۵ کتابیں بتائی گئی ہیں، اس کے بعد ۱۹۸۰ میں پیر صاحب نے ''ننگر ٹھٹھ میں تصنیف وتالیف کا جائزہ'' کے عنوان سے لکھے ہوئے ایک تحقیقی مقالہ میں جو الفابیٹیکل فہرست مخدوم صاحب کی تصنیفات کی مرتب کی ہے، اس میں ۱۳۹ کتابیں بتائی ہیں (۸) (اگرچہ اس میں چھ سات ۶۔۷ نام ایسے ہیں جو مکرر ذکر کئے گئے ہیں)۔

ادہر خانوادۂ مخدوم محمد ہاشمؒ میں ایک عالم، مخدوم غلام محمد صاحب کا کہنا ہے کہ، مخدوم محمد ہاشم کی تصانیف ۱۵۰ ہیں (۹) مخدوم امیر احمد عباسی لکھتے ہیں کہ ''بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مخدوم صاحب کی تصنیفات کی تعداد ۳۰۰ ہے (۱۰) لیکن آگے چل کر ''اتحاف الاکابر'' کے حوالہ سے ۱۱۱ کتابوں کی فہرست دے کر آخر میں ۱۳ ایسی کتابوں کا اضافہ کیا ہے کہ جو ۱۱۱ کتب میں شامل نہیں ہیں۔

یہ جاننا چاہئے کہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوویؒ نے بعض عربی وفارسی کتب پر اپنے حواشی وتعلیقات بھی چڑھائے ہیں، ایسے حواشی تعلیقات کا ذکر آپ نے ''اتحاف الاکابر'' میں نہیں کیا ہے، سوائے حاشیہ تفسیر ہاشمی کے۔ ہمیں آپ کی تصنیفات کی تعداد کے متعلق مخدوم غلام محمد صاحب کی رائے دو وجوہات کی بنیاد پر زیادہ جاندار معلوم ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ مخدوم

صاحب کے خاندان کے فرد ہونے کی حیثیت سے آپ کی رائے کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ ''صاحب البیت ادریٰ بمافیہ'' (صاحب خانہ بہتر جانتا کہ گھر میں کیا ہے)۔

دوسری وجہ یہ کہ مخدوم صاحب کی جو تصنیفات آج کل مطبوعہ یا قلمی صورت میں موجود ہیں یا جن کے صرف نام ملتے ہیں، وہ ۱۵۰ کے لگ بھگ بنتی ہے۔

لیکن ہمیں یہاں مخدوم صاحب کی تصنیفات کی تعداد کے متعلق تفصیلی بحث کرنا مقصوف نہیں ہے اور نہ ہی کوئی جامع فہرست پیش کرنی ہے۔ کیونکہ یہ ایک تحقیق طلب کام ہے۔ ہمیں اس زیر بحث مقالہ میں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مخدوم محمد ہاشمؒ کی ان تصانیف میں سے کتنی اور کونسی تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں، کتنے ایڈیشن اور کہاں کہاں طبع ہوئی ہیں، کون سے اداروں نے شائع کی ہیں اور کب چھپی ہیں، کونسی کتابیں صرف اصلی متن (بغیر ترجمہ کے) کونسی کتابیں اصلی متن مع ترجمہ (اردو یا سندھی) شائع ہوئی ہیں، اور کتنی اور کونسی کتابیں ہیں جن کے صرف تراجم الگ صورت میں طبع ہوئے ہیں، اور کون سی کتابوں کے صرف اختصار طبع ہوئے ہیں؟ کتابوں کا یہ بیان حروف تہجی کی ترتیب پر رکھا گیا ہے۔ آخر میں مقالہ کا خلاصہ بھی شامل ہے۔

مخدوم صاحب کی جو طبع شدہ کتابیں اس مقالہ میں ذکر کی گئی ہیں، وہ راقم الحروف کے پاس موجود ہیں، سوائے چند کتابوں یا ایڈیشنوں کے جن کی نشاندہی کی گئی ہے۔

(الف)

(۱)......**اتحاف الاکابر بمرویات الشیخ عبدالقادر (عربی)** مخدوم صاحب نے یہ کتاب حرمین شریفین کے مبارک سفر کے دوران ۱۱۳۶ھ میں لکھی۔ عربی میں اسانید کے متعلق جامع انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھنے والی یہ کتاب (۱)) مکمل طور پر اب تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ہے۔ البتہ اس کا اختصار امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے شاگرد ابوالفیض محمد یاسین الفادانی المکی، نے ''المقتطف من اتحاف الاکابر'' کے نام سے تیار کیا ہے۔ (۱۲) جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۴۰۷ھ میں دارالبشائر الاسلامیہ بیروت سے شائع ہوا (۱۳)

(۲)......**اصلاح مقدمۃ الصلاۃ (سندھی)** مخدوم صاحب نے سندھ کے عوام کا رجحان ''مخدوم ابوالحسن کی سندھی '' یعنی مقدمۃ الصلوٰۃ کی طرف دیکھ کر اس کا تنقیدی مطالعہ کیا اور ضروری جگہوں پر درستگی کے طور پر اپنی فارسی کتاب ''اصلاح مقدمۃ الصلوٰۃ''، لکھی (جو اب تک شائع نہیں ہوئی ہے) بعد میں پھر ''اصلاح''، کو، اسی ابوالحسن کی طرح سندھی نظم میں منظوم کیا اور اپنے وہی اشعار ابوالحسن کے ''مقدمۃ الصلوٰۃ'' کے اصل متن میں انہی مناسب مقامات پر رکھے۔ مقدمۃ الصلوٰۃ کے کئی قلمی نسخہ جات میں یہی اصلاحی اشعار ہامش پر تحریر نظر آئیں گے۔ (۱۴)

لیکن بعد میں طبع شدہ مقدمۃ الصلوٰۃ میں، متن میں شائع کئے گئے اور بعد میں ''مقدمۃ الصلوٰۃ'' ان اصلاحی اشعار

سمیت طبع ہوتا رہا ہے، ایسے اشعار کی تعداد ۹۰ ہے، بہر حال یہ ''سندھی'' یعنی ''اصلاح مقدمۃ الصلاۃ'' مستقل طور پر کبھی بھی شائع نہیں ہوسکی ہے۔

مقدمۃ الصلوٰۃ کے ان قدیم مطبوعہ نسخہ جات میں ایسا امتیاز قائم نہیں کیا گیا جس سے مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی ؒ کی طرف سے بطور اصلاح دیئے گئے اشعار الگ امتیازی حیثیت سے معلوم ہوسکیں۔ سندھی لینگویج اتھارٹی کی طرف سے پروفیسر خدیجہ بلوچ صاحبہ کے مقدمہ وتحقیق سے جو مقدمۃ الصلوٰۃ چھپی ہے، اس میں ان اصلاحی ابیات کو معکوفتین [.....] کے علامات میں رکھ کر مستقل حیثیت متعین کی گئی ہے۔

(ب)

(۳).....الباقیات الصالحات فی ذکر الازواج الطاهرات (فارسی) رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کے متعلق یہ تحقیق فارسی زبان میں مخدوم صاحب کی ہے۔ ۱۱۴۷ھ میں مرتب شدہ یہ کتاب اپنی اصلی زبان فارسی میں مستقل طور پر شائع نہیں ہوسکی ہے، البتہ اس کا سندھی ترجمہ ''الباقیات الصالحات'' کے مختصر عنوان سے، سندھ کے مشہور مبلغ حضرت مولانا محمد ادریس ڈاہری صاحب نے تیار کیا ہے، جو ڈیمی سائز کے ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۴۱۹ھ (۱۹۹۹ء) میں ادارہ خدمۃ القرآن والسنۃ شاہپور جہانیاں ضلع نوابشاہ کی طرف سے شائع ہوا، کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر مخدوم صاحب کے ایک مختصر فارسی رسالہ ''تحفة المسلمين فی تقدير مهور اُمهات المومنين '' کا سندی ترجمہ ''مترجم: مولانا ڈاکٹر عبدالرسول قادری صاحب'' بھی شامل ہے، جس کا ذکر عنقریب آرہا ہے۔

(۴).....بذل القوة فی حوادث سنی النبوة (عربی) رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ پر سنین کی ترتیب پر لکھی ہوئی یہ کتاب، صرف نبوت کے ۲۳ سال کے احوال اور سیرت کے بیان پر مشتمل ہے۔

کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول:.....قبل از ہجرت نبوت کے ۱۳ سالوں کے واقعات حصہ دوم:.....ہجرت سے وصال تک کے واقعات کا بیان۔ یہ حصہ دوم پھر تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

باب اول:.....غزوات (یعنی وہ جنگیں جن میں آپ ﷺ بنفسِ نفیس شریک تھے)

باب دوم:.....سرایا بعوث (یعنی وہ فوجی جنگیں جن میں آپ ﷺ شریک نہیں ہوئے بلکہ صحابہ کرام کو بھیجا)

باب سوم:.....غزوات وسرایا کے علاوہ کے واقعات

یہ کتاب اپنے موضوع اور ترتیب کے لحاظ سے بے مثال شاہکار ہے۔ سال ۱۱۶۶ھ کی یہ عربی تصنیف مخدوم امیر احمد عباسی کے ضخیم مقدمہ وتحقیق کے ساتھ پہلی مرتبہ ۱۳۷۶ھ/۱۹۶۶ء میں ڈیمی سائز کے ۵۳۲ صفحات پر مشتمل، سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے شائع ہوئی۔

❖.....**بذل القوۃ کے سندھی تراجم:** میری معلومات کے مطابق بذل القوۃ کے اب تک تین سندھی تراجم منظر عام پر آئے ہیں:

(۱).....نبوت جی ور ہین جو وچور: از محقق محدث علامہ غلام مصطفیٰ قاسمیؒ، یہ ترجمہ قسطوں کی صورت میں پہلے سہ ماہی ''الرحیم'' میں اور پھر ماہوار ''الرحیم'' میں (۱۹۷۶ سے ۱۹۹۰ تک) شائع ہوتا رہا بعد میں یہ سلسلہ بند ہو گیا (مکمل نہ ہو سکا)

(۲).....سیرت ہاشمی، از پروفیسر اسرار احمد علوی: ''سیرت ہاشمی'' کے نام سے بذل القوۃ کا یہ سندھی ترجمہ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ یہ ایڈیشن کراؤن سائز کے ۵۷۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۲۰۰۳ء میں مہران اکیڈمی شکار پور کی طرف سے شائع ہوا ہے اور اس کے دو ایڈیشن شائع کئے گئے ہیں، ایک عام ایڈیشن، دوسرا لائبریری ایڈیشن۔ شروع میں جامع فہرست دی ہے جو ۴۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کے پیش لفظ اور مندرجہ ذیل شخصیات کی تقاریظ سے آراستہ ہے۔

(۱) مولانا مفتی محمد جان نعیمی (۲) ڈاکٹر محمد ادریس سندھی (۳) ڈاکٹر عبدالحئی ابڑو

(۴) ڈاکٹر ثناء اللہ بھٹو (۵) مولانا محمد رمضان پھلپوٹو (اضافہ از مترجم کلیم اللہ السندی)

(۳).....بذل القوۃ (سندھی ترجمہ): مترجم مولانا ابوالسراج طفیل احمد ٹھٹوی عنقریب طبع ہونے والا ہے۔ (۱۵)

❖.....**بذل القوۃ کے اردو تراجم:** میری معلومات کی حد تک بذل القوۃ کے اب تک ۲ اردو تراجم شائع ہوئے ہیں:

(۱).....**عہد نبوت کے ماہ وسال:** از مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ، جسے کئی اداروں نے شائع کیا ہے۔ احقر نے اس کے دو ایڈیشن دیکھے ہیں:

(الف) ناشر: حسین چودھری ٹرسٹ، ۲۔سی، گلبرگ لاہور، پہلی دفعہ ۱۹۷۶ / ۱۳۹۶ میں ڈیمی سائز کے ۳۷۶ صفحات پر شائع ہوا۔

(ب) ناشر: دارالاشاعت اردو بازار، کراچی، پہلی دفعہ ۱۹۹۰ میں ڈیمی سائز کے ۳۴۲ صفحات پر شائع ہوا۔

(۲).....**سیرت سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم،** از مولانا مفتی محمد علیم الدین مجددی نقشبندی۔ بذل القوۃ کا یہ بہترین اردو ترجمہ علامہ جلال الدین قادری کے مقدمہ کے ساتھ نہایت اعلیٰ کاغذ کے ڈبل ڈیمی سائز کے ۶۱۰ صفحات پر ۱۴۲۱ھ بمطابق ۲۰۰۰ء میں ادارہ مظہر علم، کالا خطائی روڈ، شاہدرہ لاہور کی طرف سے شائع ہوا، جس میں مترجم موصوف نے بڑی عرق ریزی اور محنت سے کام کیا ہے، شروع میں جامع فہرست (جو ۴۳ صفحات پر مشتمل ہے) کے ساتھ، بذل القوۃ کی ۲۴ خصوصیات بیان کی ہیں، اس اردو ترجمہ کی خصوصیات اس طرح ہیں:

۱۔عنوان:.....یعنی سیرت کے واقعات کی سہولت کی لیے عنوان قائم کئے گئے ہیں۔

۲۔تصحیح:.....مخدوم صاحب سے اگر واقعات کے بیان میں کوئی تسامح ہوا ہے تو مترجم موصوف نے اس کی تصحیح کردی ہے۔

۳۔تطبیق:.....کسی واقعہ کے متعلق بظاہر متعارض روایات میں بہتر طریقہ سے تطبیق دی ہے۔

۴۔تمییز:.....سیرت میں شہروں اور مقامات کے ناموں کو اعراب دے کر واضح کیا ہے۔

۵۔تاریخ:.....مخدوم صاحب نے جن مقامات پر اس واقعہ کی تاریخ درج نہیں کی ہے تو مترجم موصوف نے وہ کمی پوری کردی ہے۔

۶۔تائید:.....کہیں کہیں، مؤلف (مخدوم صاحب) کی تائید میں حاشیہ میں روایات ذکر کی ہیں۔

۷۔تفسیر:.....سیرت میں درج قرآنی آیات یا احادیث کے مشکل مقامات کی تفسیر اور وضاحت کی ہے۔

۸۔تکمیل:.....اگر مخدوم صاحب نے کہیں واقعہ کے بعض جزئیات کا ذکر نہیں کیا ہے تو مترجم موصوف نے ان جزئیات کو ذکر کرکے واقعہ کی تکمیل کردی ہے۔

۹۔تفہیم:.....کہیں کہیں مبہم الفاظ کی تشریح کی ہے۔

اردو ترجمہ ''عہد نبوت کے ماہ وسال'' کا پھر سندھی ترجمہ:..... پہلے اردو ترجمہ (عہد نبوت کے ماہ وسال) کا سندھی ترجمہ ''محمد مصری خان میمن'' نے تیار کیا ہے، جو مکتبہ اصلاح وتبلیغ، حیدرآباد کی طرف سے شائع ہورہا ہے۔(۱۶)

۵.....بناء الاسلام (سندھی) اسلامی عقائد کے بیان میں ۱۱۴۳ھ میں سندھی اشعار میں مرتب کردہ مخدوم صاحب کی یہ کتاب دو ابواب اور خاتمہ پر مشتمل ہے: باب اول: ایمان مفصل میں وارد، سات صفات کے بیان میں ہے۔ باب دوم: ان مسائل کے بیان میں، جو مذکورہ صفات کے علاوہ ہیں۔ خاتمہ: ایمان مجمل کے بیان میں۔ تین ناموں (عقائد اسلام، بناء الاسلام اور عقائد ھاشمی) کے نام سے شہرت یافتہ یہ کتاب کئی بار شائع ہوچکی ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے:

(۱)..... بناء الاسلام، مطبوعہ مرغوب ہردیار بمبئی: یہ مطبوعہ کراؤن سائز کے ۴۲۴ صفحات پر، حاجی محمد کاتب سمہ کی کتابت سے ۱۲۹۴ھ میں حاجی قاضی ابراھیم بن حاجی الحرمین قاضی نور محمد متوطن پلندر کی سعی سے چھاپہ خانہ مرغوب ہردیار بمبئی میں طبع ہوکر منظرِ عام پر آیا۔

(۲)..... بناء الاسلام، گلستان کشمیر والا چھاپہ: یہ چھاپہ کراؤن سائز کے ۴۲۴ صفحات پر قاضی ابراھیم بن قاضی نور محمد کی سعی سے چھاپہ خانہ ''گلستان کشمیر'' سے چھپ کر منظر عام پر آیا، (شہر کا نام درج ہے اور نہ سال ہی لکھا ہوا ہے)

(نوٹ):.....قاضی ابراھیم کے لیے ٹائٹل پر لکھا ہوا ہے ''سلمہ اللہ''۔ اس کے متعلق قارئین کرام کو معلوم ہونا چاہئے کہ قاضی مدنی یا میاں مدنی، مخدوم محمد اکرم نصر پوری رحمتہ اللہ علیہ کے فرزند تھے، جس کا اصل نام ''محمد'' تھا (۱۷)۔ لیکن مدینہ منورہ میں ولادت کے سبب ''میاں مدنی'' کے لقب سے مشہور تھے (۱۸) اس ایڈیشن کے ٹائٹل سے معلوم ہوا کہ سندھی کتابوں کے مشہور ناشر قاضی ابراھیم یا قاضی نور محمد بمبئی والے میاں مدنی کی اولاد میں سے ہیں۔

(۳)...... بناءالاسلام چھاپخانہ صفدری بمبئی والا: عبدالرحمٰن شیخ کی کتابت سے یہ ایڈیشن ڈیمی سائز کے ۳۱۲ صفحات پر شیخ نورالدین بن جیواخان کے اہتمام کے تحت، یوسف علی آدمجی (مالک مطبع صفدری) ۱۳۱۵ھ میں چھاپخانہ صفدری بمبئی میں طبع ہوا۔

(۴)...... بناءالاسلام، قاضی عبدالکریم بمبئی والا ایڈیشن: یہ ایڈیشن دو کالموں پر مشتمل، رائل سائز کے ۱۶۰ صفحات پر قاضی عبدالکریم بن قاضی نور محمد کے اہتمام تحت ۱۳۲۰ھ میں شائع ہوا۔

(۵)...... بناالاسلام، مطبع گلزار حسینی والا ایڈیشن: یہ ایڈیشن بھی دو کالموں پر مشتمل ہے۔ جو رائل سائز کے ۱۶۰ صفحات پر ۱۳۴۳ھ میں قاضی عبدالکریم صاحب نے مطبع گلزار حسینی سے چھپوا کر منظر عام پر لایا(۱۹)

(۶، ۷، ۸)......موجودہ رسم الخط میں ڈھلا ہوا نصر پور والا نسخہ:......نصر پور کے رہائشی، استاد محمد یوسف ''شاکر'' ابڑو مرحوم (۲۰) نے بناء الا اسلام کو موجودہ رسم الخط میں منتقل کیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں کراؤن سائز کے ۳۶۲ صفحات پر حاجی احمد خان ابڑو کلاتھ مرچنٹ ابڑو محلّہ نصر پور کی طرف سے، دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۳ء میں کراؤن سائز کے ۲۶۴ صفحات پر اسی ناشر کی طرف سے اور تیسرا ایڈیشن (مقدمہ، سوانح وفہرست مضامین پر مشتمل) کراؤن سائز کے ۲۸۰ صفحات پر اسی ناشر کی طرف سے شائع ہوا۔

(۹، ۱۰)......محمد اسماعیل کمھار ٹھٹوی والا ایڈیشن: ''بناالا اسلام المعروف بنیادالا یمان''

فقیر محمد اسماعیل کمھار ٹھٹوی نے اصل کتاب کو جدید رسم الخط میں بلکہ جدید لباس میں اپنی طرف سے کچھ اشعار اضافہ کر کے مرتب کیا، جو پہلی مرتبہ گرین کلر کے ٹائٹل کے ساتھ ۱۹۶۴ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۷۰ء میں شاہ جہانی مسجد ٹھٹہ کی تصویر پر مشتمل بلیک اینڈ وائیٹ ٹائٹل سے ڈبل ڈیمی سائز کے ۳۲ صفحات پر میاں عبدالحسین ولد حاجی علی محمد و تنجھر ٹھٹوی نے اپنے اخراجات سے چھپوا کر مفت تقسیم کیا۔

(۱۱)...... بناء الاسلام مطبوعہ ۱۹۰۶ء: یہ ایڈیشن راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذرا، البتہ فقیر محمد اسماعیل ٹھٹوی نے ''بنیادالا یمان'' کے مقدمہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے کہ ۱۹۰۶ء کا ایڈیشن ان کے پاس موجود ہے(۲۱)

(ت)

۶...... تحفة الاخوان فی منع شرب الدخان (فارسی) مخدوم صاحب نے اس رسالہ میں حقہ اور تمباکو نوشی کے شرعی حکم کو بیان کیا ہے اور شرعی دلائل کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ تمباکو نوشی حرام/مکروہ تحریمی ہے۔ یہ رسالہ ایک مقدمہ، چار فصول اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ ۱۱۳۴ھ کی تصنیف شدہ یہ کتاب، اصل فارسی میں تو اب تک شائع نہیں ہوسکی ہے۔ البتہ اس کا تلخیص شدہ سندھی ترجمہ، مولانا مفتی محمد قاسم مشوری صاحب کا تیار شدہ گیارہ ''رسائل قاسمیہ'' کے ضمن میں شائع ہوا ہے اور یہ رسالہ ان گیارہ رسائل میں آخری رسالہ ہے (یہ گیارہ رسائل مشوری صاحب کے ہی ہیں) یہ مجموعہ شعبہ نشر و

اشاعت درگاہ شریف مشوری، لاڑکانہ کی طرف سے ڈیمی سائز کے ۲۶ صفحات پر شائع ہوا، سال لکھا ہوا نہیں ہے۔

معلوم ہونا چاہئے کہ تحفۃ الاخوان کے رد میں پنجاب کے ایک عالم عنایت اللہ لاہوری نے فارسی میں ایک کتاب لکھی تھی جو فوٹو اسٹیٹ کی صورت میں راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔

۷...... **تحفة القاری بجمع المقاری (عربی)**: قرآن کریم میں مروج رکوع علماء بخارا کے مرتب کردہ ہیں جن کو ''بخاری رکوع'' کہا جاتا ہے، چونکہ یہ رکوع ایک جیسے نہیں ہیں کوئی رکوع بڑا ہے تو کوئی چھوٹا، ادھر فقہ حنفی میں یہ مسئلہ ہے کہ ہر نماز کی آخری رکعت کی قراءت، پہلی رکعت کے مقابلہ میں طویل نہ ہونی چاہئے اور نہ پہلی رکعت کو دوسری رکعت سے زیادہ طویل کرنا صحیح ہے۔ جبکہ نماز تراویح میں حفاظ کرام اگر اپنی قرات، بخاری رکوعات کے مطابق جاری رکھیں گے تو بعض اوقات پہلی رکعت، دوسری رکعت سے دوگنی نہیں تو کم از کم طویل ضرور ہو جائے گی، جس سے کراہت لازم ہوگی، یا ترک مستحب کا ارتکاب ہوگا۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے، مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی ۱۱۵۰ھ میں تحفة القاری بجمع المقاری کے نام سے یہ کتاب بزبان عربی تصنیف فرمائی، جس میں آپ نے قرآن کریم کی آیات وکلمات کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ہر پارے کے برابر ۱۲۔۱۲ رکوع بنائے ہیں تا کہ کراہت کے ارتکاب سے بچا جا سکے۔

تحفۃ القاری، عربی اور سندھی دونوں زبانوں میں شائع ہوئی ہے، عربی متن دو محققین کی تحقیق سے منظر عام پر آیا ہے:

(۱)...... مفتی محمد جان نعیمی کی تحقیق وتخریج کے ساتھ ڈیمی سائز کے ۸۸ صفحات پر ۱۴۲۱ھ مطابق ۲۰۰۰ء میں خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ، مکتبہ مجددیہ نعیمیہ، ملیر کراچی کی طرف سے شائع ہوا۔

(۲)...... ڈاکٹر مولانا قاری عبدالقیوم بن عبدالغفور السندی، اسسٹنٹ پروفیسر ام القریٰ یونیورسٹی، مکۃ المکرّمہ کی تحقیق کے ساتھ ۱۴۲۲ھ /۲۰۰۱ء میں خود قاری صاحب کی طرف سے سندھی ترجمہ ''ھاشمی رکوع'' کے آخر میں چھپا ہے، جس کا ذکر آ رہا ہے۔

❖...... **سندھی ترجمہ**:...... تحفۃ القاری کا سندھی ترجمہ ''قرآن کریم جا ہاشمی رکوع'' کے نام سے پہلی مرتبہ ماھوار ''السند'' شمارہ نمبر ۸۰ ستمبر ۲۰۰۰ء اسلام آباد سے اور دوسری مرتبہ عربی متن کے ساتھ ڈیمی سائز کے ۲۷ صفحات پر ۱۴۲۲ھ /۲۰۰۰ء میں انجمن خدام التجوید کندھکوٹ کے طرف سے شائع ہوا۔

۸ التحفة المرغوبة فی افضلیة الدعاء بعد المکتوبة (عربی) فرض نماز کے بعد اجتماعی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کے سنت اور افضل ہونے کی بابت مخدوم صاحب کی ۱۱۶۸ھ میں تصنیف کردہ یہ عربی کتاب دو ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے جس کے دو عربی ایڈیشن اور دو اردو تراجم راقم الحروف کی نظر سے گذرے ہیں۔

❖...... **عربی ایڈیشن**: (۱) سب سے پہلے ''التحفۃ المرغوبۃ'' (عربی) استاد مفتی پروفیسر سید شجاعت علی قادری کے مقدمہ تحقیق وتخریج کے ساتھ ڈیمی سائز کے ۵۲ صفحات پر، ۱۹۸۳ء میں لجنۃ التصنیف والتالیف دارالعلوم نعیمیہ کراچی کی

طرف سے شائع ہوا۔

(۲)اس کے بعد التحفۃ الرغوبۃ کا عربی اختصار، بلادعرب کے مشہور محدث شیخ عبدالفتاح، ابوغدہؒ کی تحقیق کے ساتھ ۱۶۴صفحات کے ایک ہی مجموعہ میں رائل سائز میں ۱۹۹۷ء میں مکتب المطبوعات الاسلامیہ حلب/شام کی طرف سے شائع ہوا، اس مجموعہ میں ۳رسائل ہیں:

(۱).....التحفة المرغوبة للشيخ محمد هاشم التتوى السندى(۲۶صفحات،۳۳تا۴۸تک)

(۲).....المخ المطلوبة للشيخ احمد بن الصديق الغمارى

(۳).....سنية رفع اليدين فى الدعاء بعد الصلوٰة المكتوبة

یادرہے کہ آخری دونوں رسائل کا موضوع بھی ایک ہے اور محقق بھی ایک ہے۔

❖.....**اردو تراجم:(۱)** ''شاندار تحفہ'' (فرض کے بعد دعا) کے عنوان سے یہ اردو ترجمہ ۱۹۹۴ء میں پروفیسر ڈاکٹر محمد اشرف سموں نے تیار کیا جو عربی متن کے ساتھ ڈیمی سائز کے ۸۰صفحات پر، الراشد اکیڈمی کراچی کی طرف سے شائع ہوا۔

۲۔''نماز اور حضور ﷺ کی دعا'' کے عنوان سے یہ اردو ترجمہ ۱۹۹۸ء میں محمد شہزاد مجددی سیفی نے مرتب کیا، جو بغیر عربی متن کے ۱۹۹۹ء میں سنی لٹریری سوسائٹی ۴۹ ریلوے روڈ لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔

۹.....**تحفة المسلمين فى تقدير مهور امهات المومنين (فارسی):** رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اپنی ازواج مطہرات (امہات المومنین) کو دیے گئے مہر کے متعلق فارسی میں مخدوم صاحب کا ۱۱۷۱ھ میں تیار کردہ یہ رسالہ، رائل سائز کے ۶صفحات پر مشتمل ۱۹۹۲ء میں ''رحمت بھرپور سالو'' (جو مرتضائی سماجی خدمتگار انجمن لاڑکانہ کی طرف سے قسطوار شائع ہوتا ہے) کے آٹھویں شمارہ کے ضمن میں ایک قلمی نسخہ کے عکس کی صورت میں شائع ہوا۔

❖.....**سندھی ترجمہ:** تحفۃ المسلمین کا سندھی ترجمہ، مولانا ڈاکٹر عبدالرسول قادری نے ۱۴۱۹ھ میں کیا جو ڈیمی سائز کے ۱۴صفحات پر، مخدوم صاحب کی ایک اور کتاب ''الباقیات الصالحات'' (جس کا ترجمہ مولانا محمد ادریس ڈاہری نے کیا) کے ضمیمے کے طور پر ادارہ خدمت القرآن والسنۃ شاہپور جہانیاں ضلع نواب شاہ کی طرف سے ۱۴۱۹ھ میں شائع ہوا۔

۱۰..... **ترصيع الدرة على درهم الصرة (عربی)**

مخدوم صاحب نے نماز میں دوران قیام ''ہاتھ ناف پر باندھنے'' کی تائید کرتے ہوئے جب شیخ ابوالحسن کبیر ٹھٹوی کے رد میں ''درھم الصرۃ'' کے نام سے رسالہ لکھا تو شیخ محمد حیات سندھیؒ نے اس کا جواب دو رسالوں میں دیا، مخدوم محمد ھاشم ٹھٹویؒ نے دونوں رسائل کا جواب لکھا۔

یہ کتاب (ترصیع الدرۃ) پہلے رسالے کے جواب میں لکھی ہوئی ہے، جبکہ دوسرے رسالے (درۃ فی اظہار غش نقد الصرہ) کے جواب میں ''معیار النقاد'' لکھی جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

ترصیع الدرۃ: مجموعہ خمس رسائل (۵ رسائل کا مجموعہ) کے ضمن میں دو دفعہ چھپ چکی ہے:

(۱).....۱۴۰۳ھ میں افغانستان سے مولانا شبیر احمد منیب کی طرف سے، فارسی مجموعہ میں ترصیع الدرۃ صرف ۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲).....۱۴۱۴ھ میں ادارۃ القرآن کراچی کی طرف سے اس مجموعہ میں ترصیع الدرۃ ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے، دونوں طباعتوں کا ذکر ''درھم الصرۃ'' میں آرہا ہے۔

۱۱.....تفسیر ھاشمی پارہ عم (سندھی)

سندھی اشعار کے ساتھ ۱۱۶۲ھ میں مخدوم صاحب کی تصنیف کردہ پارہ عم (سورۃ نباء سے سورۃ الناس تک) کی تفسیر پر مشتمل یہ تفسیر کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

۱.....قاضی نور محمد والا ایڈیشن: ۱۲۸۸ھ میں ڈیمی سائز کے ۵۰۴ صفحات پر قاضی نور محمد بن مرحوم قاضی عبدالکریم کی کوشش سے آپ کے مطبع نامی کریمی واقع جزیرہ بمبئی میں چھپا۔

۲.....قاضی عبدالکریم والا ایڈیشن: ۱۳۳۰ھ میں ڈیمی سائز کے ۵۰۴ صفحات پر قاضی عبدالکریم بن قاضی نور محمد صاحب (تاجر کتب، مالک مطبع کریمی وفتح الکریم) مطبع کریمی واقع بمبئی سے چھپوا کر شائع کیا۔

۳.....سندھی ادبی بورڈ والا ایڈیشن: ۱۴۰۸ھ /۱۹۸۷ء میں دوسرے نمبر ایڈیشن کا عکس ڈیمی سائز کے ۵۵۶ صفحات پر مشتمل سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد کی طرف سے چھپا، جس کا مقدمہ علامہ غلام مصطفیٰ قاسمیؒ نے لکھا (جو ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے)، آخر میں شیخ محمد اسماعیل کی محنت سے تفسیر ہاشمی میں وارد مشکل الفاظ کے معانی پر مشتمل ضمیمہ بھی دیا گیا ہے، جو ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے، آخر میں ۱۰ صفحات پر مشتمل استدراک رامہ بھی شامل ہے۔

تفسیر ہاشمی کو موجودہ رسم الخط میں ڈھالنے کی کوشش

(الف) استاد محمد یوسف نصر پوری کی طرف سے، جس نے تفسیر کے ابیات کو برقرار رکھتے ہوئے صرف رسم الخط کو جدید بنایا، ان کا منصوبہ تو ۵ حصہ شائع کرنے کا تھا لیکن صرف دو حصے شائع ہو سکے۔

۱۔ حصہ اول: سورۃ فاتحہ، ناس، فلق، اخلاص، لہب، نصر، کافرون کی تفسیر پر مشتمل، جو رائل سائز کے ۳۲ صفحات پر جدید ٹائپ میں قرآن پریس حیدر آباد سے طبع ہوا۔

۲۔ حصہ پنجم: سورۃ النباء، نازعات، عبس، تکویر، انفطار، تطفیف اور انشقاق کی تفسیر پر مشتمل جو رائل سائز کے ۴۰ صفحات پر جدید ٹائپ میں فردوس پریس حیدر آباد سے طبع ہو کر منظر عام پر آیا۔ یاد رہے کہ یہ دونوں حصے حاجی احمد خان ابڑو (ابڑا محلّہ) نصر پور کی طرف سے شائع ہوئے۔

(ب) ڈاکٹر عبدالمجید میمن سندھی کی طرف سے۔ جس نے تفسیر ھاشمی کو موجودہ نثر کی صورت میں منتقل کیا، البتہ آیات

کا ترجمہ عوام کی سہولت کیلئے مولانا امروٹی کے ترجمہ قرآن سے لیا، شروع میں مقدمہ بھی لکھا۔ اسی تفسیر ھاشمی کے تین ایڈیشن مہران اکیڈمی شکارپور کی طرف سے ڈیمی سائز کے ۳۱۲ صفحات پر شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) پہلا ایڈیشن دسمبر ۱۹۹۱ء، (۲) دوسرا ایڈیشن جنوری ۱۹۹۴ء (۳) تیسرا ایڈیشن اپریل ۲۰۰۲ء

۱۲.....تمام العناية فی الفرق بين الصريح والكناية (عربی)

مخدوم صاحب کا ۱۱۵۶ء میں طلاق کے ایک خاص مسئلہ کے متعلق عربی میں تصنیف کردہ یہ مختصر رسائل، رائل سائز کے ۸ صفحات پر ۱۳۰۰ھ میں مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خان میں چھپا۔

میاں محمد عمر نامی ایک شخص نے مخدوم غلام محمد (از اولاد مخدوم محمد ھاشم ٹھٹوی) سے تمام العنایۃ کا قلمی نسخہ، جو مصنف کا خود نوشتہ تھا، حاصل کر کے عبدالواحد بن محمد مصطفیٰ خان کو دیا تھا، جس نے اپنے مطبع سے چھاپ کر شائع کیا، رسالہ کا متن صرف ۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ (۲۲)۔ آخر میں دو صفحات پر کتاب کے ساتھ متعلقہ فقہی مسائل پر مشتمل ضمیمہ شامل ہے۔

''تمام العنایۃ'' میں سندھ میں رائج ایک قسم کی طلاق ''موں چھڈی، موں چھڈی، موں چھڈی'' (میں نے چھوڑ دی) تین مرتبہ کہنے کا شرعی حکم بتایا گیا ہے کہ یہ تینوں الفاظ تین مرتبہ سے کسی بھی ایک دفعہ میں شوہر کی نیت اگر تین طلاق کی ہے تو تین طلاقیں ہو جائیں گی؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر پہلی دفعہ ''میں نے چھوڑ دی'' کہنے سے ایک طلاق بائن واقع ہو گی۔ باقی دو دفعہ کہا ہوا لغو ہو جائے گا (کیونکہ بائن کے بعد کوئی بھی دی گئی طلاق واقع نہیں ہوا کرتی)

یہی تمام العنایۃ کمپیوٹر کمپوزنگ کی شکل میں مدرسہ صبغۃ الھدیٰ شاہپور چاکر ضلع سانگھڑ کی طرف سے شائع ہونے والے سہ ماہی رسالہ ''الھدیٰ'' کے شمارہ ۱۱ (اگست تا اکتوبر ۱۹۹۸ء) میں ۴ صفحات پر شائع ہوا ہے۔

حال ہی میں مفتی کلیم اللہ صاحب نے اسی رسالہ کو ایڈٹ کیا ہے اور راقم الحروف نے اسی کا مقدمہ عربی میں لکھا ہے اور قاری عبدالقیوم بن عبدالغفور السندی پروفیسر جامع ام القریٰ کی تصحیح و مراجعت کے بعد یہ رسالہ مکتبہ قاسمیہ کنڈیارو، سندھ کی طرف سے ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔

۱۳.....تنبیہ نامہ (بے نمازیوں اور عاشورہ کے متعلق) (سندھی): مخدوم صاحب کے طرف منسوب اس منظوم سندھی رسالہ کا ذکر مخدوم صاحب نے خود اتحاف الاکابر میں کیا ہے اور نہ کسی اور تذکرہ نگار نے اس کا نام بتایا ہے، البتہ یہی رسالہ تین سندھی رسائل کے ایک مجموعہ میں (جس میں یہ رسالہ پہلے نمبر پر ہے) ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) میں ڈیمی سائز کے ۴۸ صفحات (جس میں رسالہ کے صرف ۷ صفحات ہیں) قاضی نور محمد قریشی بن مخدوم محمد حسین صاحب قریشی بالائی نقشبندی (تاجر کتب لاڑکانہ) صرف ۳۵ کی تعداد میں مطبع مصطفائی لاہور سے شائع کیا، دوسرے رسائل یہ ہیں:

۲۔ رسالہ صفت چار یار۔ مخدوم غلام محمد بگائی۔ ۳۔ رسالہ تنبیہ برائے عاشورہ کرنیوالوں اور بے نمازیوں کے

۔میاں عبدالھادی بگائی

❖ مجموعہ میں ایک جگہ حاشیہ میں تحریر ہے:

یہ تینوں رسائل تنبیہہ برائے جاہلان حسب خواہش پیر میاں محمد صالح شاہ صاحب خلف پیر قطب الدین ٹھلاہی اور پیر شاہ عباس اور پیر میاں علی اکبر شاہ صاحب اور جناب پیر میاں علی اصغر شاہ کنگری والوں کے چھپوائے گئے ہیں کہ اپنے فقیروں مریدوں اور جماعتی طریقہ والوں کو رشد و ہدایت کیلئے سعی و کوشش کریں یا ہمارے ساتھ تعاون کریں کہ خدا کرے اس کتاب کے واسطے سے اور پیر صاحب کے تعاون سے لوگ عاشورہ کے ماتم وغیرہ کے دیکھنے سے باز رہیں۔(۲۳)

مجموعہ کے ٹائٹل کے اوپر ''تنبیہہ الجاہلین'' تحریر ہے، اس ٹائٹل کے وسط میں لکھتے ہیں کہ الحمدللہ کہ تین رسائل نصیحت نامہ تنبیہہ جاھلین و بے دین اور منع عاشورہ بابت تصنیف (۱) مخدوم میاں محمد ہاشم ٹھٹوی (۲) مخدوم میاں غلام محمد بگائی (۳) مخدوم میاں عبدالھادی.....الخ

۱۴.....تنقیح الکلام فی النھی عن القرأة خلف الامام (عربی) احناف کے مسلک کے مطابق اور حدیث کی روشنی میں امام کے پیچھے قرات نہ کرنے کی تائید میں مخدوم صاحب کی عربی زبان میں ۱۱۶۹ھ میں تصنیف کردہ یہ کتاب چار ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

تنقیح الکلام کا اردو ترجمہ مولانا عبدالعلیم ندوی (متوفی ۱۹۸۷ء) نے تیار کیا جو عربی متن کے ساتھ، ڈیمی سائز کے ۲۲۴ صفحات پر ۱۴۱۵ھ میں جامعہ مدینۃ العلوم بھینڈو شریف (نزد حیدرآباد) کی طرف سے شائع ہوا۔

(ج)

۱۵.....جنة النعیم فی فضائل القرآن الکریم (عربی): قرآن کریم کے فضائل کے متعلق احادیث نبویہ کی روشنی میں ۱۱۳۴ھ میں تیار کردہ، مخدوم صاحب کی یہ جامع کتاب اب تک مکمل طور پر شائع نہیں ہوسکی ہے، البتہ اس کا ایک اختصار، اردن سے ''حبة الرحمٰن الرحیم فی فضائل القرآن الکریم'' کے نام سے شائع ہوا ہے، جس میں اختصار کرنے والے نے اصل مصنف کا نام ٹائٹل پر نہیں لکھا ہے۔(۲۴)۔اگرچہ اندر کتاب میں اصل مؤلف مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی بتایا گیا ہے۔(۲۴) مگر اس کے باوجود بھی یہ روایت قابل بھروسہ شمار نہیں کی جائے گی۔

.....(جاری ہے).....

☆.....☆.....☆

دینی اور عصری علوم

مولانا محمد اعظم قاسمی

علم ایک ایسی روشنی ہے جو ہمیشہ انسان کے ساتھ رہتی ہے، اللہ کے سوا کوئی اس کو چھین نہیں سکتا۔علم کے ذریعے انسان اپنے بہت سے مسائل حل کرلیتا ہے، بہت ایسی گتھیاں جن کو بے علم آدمی نہیں سلجھا سکتا، ان کو صاحبِ علم آسانی سے سلجھالیتا ہے۔علم کی بدولت معاشرہ ترقی کرتا ہے، رہن سہن میں تبدیلی آتی ہے، تجارت ترقی کرتی ہے، سیاست میں نکھار آتا ہے، صاحبِ علم کی فکر بلند ہوتی ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، اس کا ہر عمل اس کی تہذیب، سلیقہ اور ادب کی غمازی کرتا ہے۔اس کی عزت ہوتی ہے، اکرام کیا جاتا ہے، بلند مقام ومنصب پر فائز کیا جاتا ہے۔کبھی کبھی تحصیل علم میں محنت کرنے والا ثریٰ سے ثریا پر لمحوں میں پہنچ جاتا ہے۔

یہ بات ہر ایک کے نزدیک مسلم ہے کہ علم کوئی بھی ہو صاحبِ علم کو فائدہ دیتا ہے، اگر وہ علم آخرت کے لیے حاصل کرتا ہے، تو اخروی فلاح وبہبودی سے بہرہ ور ہوتا ہے اگر علم سے دنیا حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے تو دنیا میں کامرانی نصیب ہوتی ہے۔اب سوال یہ ہے کہ مسلمان کو بحیثیت مسلمان کون سا علم حاصل کرنا چاہیے؟ دینی علم یا دنیوی علم؟ یا کون سا علم ضروری اور قابل ترجیح ہے؟ تو ہر عقل مند یہی جواب دے گا کہ بحیثیت مسلمان اتنا دینی علم ضروری اور فرض ہے جس سے ہر شخص کو روزمرہ پیش آنے والے مسائل معلوم ہوجائیں، اور یہ جان سکے کہ فلاں کام میں اللہ کی مرضی کیا ہے، آیا اللہ چاہتا ہے کہ وہ یہ کام کرے؟ یا یہ چاہتا ہے کہ وہ یہ کام ترک کردے؟ اگر اتنا علم حاصل ہوگیا ہے تو فرض عین ادا ہوگیا اب مزید علومِ دینیہ میں مہارت پیدا کرنا فرض کفایہ ہے۔ جہاں تک علومِ عصریہ کی بات ہے تو اس کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ کوئی ایسا علم نہ ہو جو اسلامی عقائد کے ڈھانچے ہی کو مسمار کردے۔

علومِ اسلامیہ:.....علومِ اسلامیہ وہ علوم ہیں جن سے اسلامی معلومات حاصل ہوں، ان میں سرفہرست قرآن، حدیث اور فقہ اسلامی کا علم ہے، یہی مقصود ومطلوب ہے اور یہی براہ راست اسلامی علم ہے۔اس کو سمجھنے کے لیے جن علوم

کی ضرورت پڑتی ہے وہ بھی بالواسطہ اسلامی علوم ہیں، کیوں کہ وہ مقصود نہیں ہیں، بلکہ مقصود کے حصول کا ذریعہ ہیں۔اس قسم کے علوم بہت سے ہوسکتے ہیں، جیسے نحو، صرف، بلاغت، اُصول تفسیر، اُصول حدیث، اُصول فقہ، علم کلام، تاریخ (اگر اس سے قرآن کے نزول اس کے پس منظر اور مختلف ادوار میں مسلمانوں اور اسلام کی صحیح صورتِ حال سے آگاہی مقصود ہو) جغرافیہ (اگر قرآن وحدیث میں آئے ہوئے مقامات کو بصیرت کے ساتھ سمجھنے کی نیت ہو) سائنس (اگر اس کے ذریعے مخلوق میں غور کر کے اللہ کی معرفت حاصل کی جائے) وغیرہ۔

یہی وہ علوم ہیں جن سے اللہ کی معرفت حاصل ہوسکتی ہے، انسان اپنے خالق کو پہچان سکتا ہے اور اپنے رب سے شناسائی ہوسکتی ہے۔ عادتاً ایسا ہی ہوتا ہے، اگر کبھی ان علوم کے علاوہ سے بھی اللہ کی معرفت حاصل ہوجائے، تو ایسا شاذ ونادر ہی ہوتا ہے جب کہ اس میں کبھی بھی راہ بھٹکنے کا خطرہ بھی درپیش رہتا ہے۔ بہرحال ان ہی علوم کی فضیلت قرآن وحدیث میں آئی ہے، ان ہی کی تحصیل کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے بارے میں مدنی آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

عن ابی الدرداء رضی اللّٰہ عنہ، قال: فإنی سمعتُ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول: من سلك طریقا یطلب فیه علما سلك اللّٰہ به طریقًا من طرق الجنة وإن الملائکة لتضع أجنحتها رضا لطالب العلم وإن العالم لمستغفرله من في السموات ومن في الأرض والحیتان في جوف الماء وإن فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلة البدر علی سائر الکواکب وإن العلماء ورثة الأنبیاء وإن الأنبیاء لم یورثوا دینارا ولا درهمًا بل ورثوا العلم فمن أخذه أخذ بحظ وافر۔

''حضرت ابوالدرداؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ ارشاد فرماتے تھے کہ جو بندہ علم دین حاصل کرنے کے لیے کسی راستے پر چلے گا، اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کو جنت کے راستوں میں سے ایک راستے پر چلائے گا اور اللہ کے فرشتے طالبانِ علم کے لیے اظہارِ رضا کے طور پر اپنے بازو جھکا دیتے ہیں اور فرمایا کہ علم دین کے حامل کے لیے آسمان وزمین کی ساری مخلوقات اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی استدعا کرتی ہیں، یہاں تک کہ دریا کے پانی کے اندر رہنے والی مچھلیاں بھی، اور عبادت گزاروں کے مقابلے میں علماء کو ایسی فضیلت حاصل ہے جیسی کہ چودھویں رات کے چاند کو آسمان کے باقی ستاروں پر اور علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء علیہم السّلام نے دیناروں اور درہموں کا ترکہ نہیں چھوڑا ہے، بلکہ انھوں نے اپنے ترکے اور ورثے میں صرف علم چھوڑا ہے، تو جس نے اس کو حاصل کرلیا اس نے بہت بڑی کامیابی اور خوش بختی حاصل کرلی۔

اسی علم سے دین کی سمجھ پیدا ہوتی ہے، جس پر آخرت کی کامیابی کا مدار ہے اور اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے، اس کو دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عن أبي هريرة رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من يرد الله به خيرا يفقهه فى الدين۔" (المعجم الاوسط: ٥٤٢٤)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سوجھ بوجھ عطا کر دیتا ہے۔

حاصل یہ کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دینی علوم کو بقدرِ ضرورت حاصل کرنا فرض ہے اور ان میں درک ومہارت حاصل کرنا جب کہ دیگر ماہرین موجود ہوں مستحسن ہے، ورنہ فرض ہے اور دنیوی علوم بھی جائز ہیں، مگر ہاں اگر کوئی علم عقیدہ فاسد کرتا ہو یا اس کو حاصل کرنے میں اللہ کی صریح نافرمانی ہوتی ہو یا معاصی میں مبتلا ہونے کا یقین ہو، تو قطعاً جائز نہیں ہے۔

دنیوی یا عصری علوم:.....دنیوی علوم عام طور پر وہ سمجھے جاتے ہیں جو اسکولوں میں پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں، جن کا مقصد اچھی ڈگری حاصل کرنا اور ان کے ذریعے بڑے بڑے عہدوں تک رسائی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ یہی وہ علوم ہیں جن کے جاننے والے عموماً ہر ملک میں بڑے بڑے مناصب پر فائز ہوتے ہیں، سرکاری نوکریاں ان ہی کی بنیاد پر ملتی ہیں، ایسے ہی لوگوں کا پرائیوٹ کمپنیوں پر غلبہ ہوتا ہے، یہی لوگ اجنبی ملکوں میں بھی اچھی ملازمتیں حاصل کرتے ہیں۔

ایسے لوگوں میں سے ایک بہت بڑا طبقہ وہ ہے جو دین سے بیگانہ ہے، نہ بچپن میں دینی علوم حاصل کیے، نہ وہ دینی کتابیں پڑھتے ہیں نہ دینی باتیں سنتے ہیں اور نہ ایسے لوگوں کے پاس بیٹھتے ہیں جو ان کو دینی مسائل بتائیں، بلکہ ان میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو علماء کو بدھو گردانتے ہیں، ان کو تنگ نظر اور قوم کو پستی میں لے جانے والے سمجھتے ہیں اور اگر کبھی موقع پاتے ہیں تو دریدہ دہنی کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ بہت سے ایسے اسکول ہیں جن میں وہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں، جن میں شرک کی آمیزش ہوتی ہے، خاص طور سے مشنری اسکول تو اسی مقصد کے لیے گویا چلائے جارہے ہیں کہ مسلمان بچوں کے کورے دماغوں پر نصرانیت کی چھاپ چھوڑ دی جائے، وہ نام کے مسلمان باقی رہیں، ان کے ذہنوں میں عیسائیت کی فکریں گردش کرتی ہوں اور ان کے قلوب مسیحیت کی محبت سے سرشار ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو کم سے کم موجودہ مذہب عیسوی کی برائی ان کے دل سے نکل چکی ہو اور وہ اس کی روایتوں اور رواجوں پر جان چھڑکتے ہوں اور اس کی ہر رسم کو اپنے لیے ترقی کی علامت (Symbol of Progress) سمجھتے ہوں۔

ایسے اسکول اور ایسی تعلیم اُمت مسلمہ کے لیے ناسور ہے اور قوم کی رگوں میں دوڑنے والا وہ خون ہے جو کینسر سے

متاثر ہو چکا ہے۔ایسی تعلیم آتے ہی دین کا جنازہ گھروں سے اور سماج سے نکل جاتا ہے،اس کا مشاہدہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ آپ شاید ایسے لوگوں کو جانتے ہوں جن کی تعلیم انگلش میڈیم اسکولوں میں ہوئی، آپ دین کے بارے میں ان کی رائے لے کے دیکھیے،ان میں سے اکثر کی فکروں میں اتنا توسع آجاتا ہے کہ ہر چیز کو جائز سمجھنے لگتے ہیں،اباحیت پسندی ان کی طبیعت بن جاتی ہے۔

دہلی میں جس وقت راقم انگلش سیکھنے کے لے ایک ادارے (Institute) میں زیر تعلیم تھا،جس کو چلانے والے امریکن انگریز تھے اور اس وقت ہی پڑھاتے بھی تھے،اس میں تعلیم پانے والے تقریباً ۹۵ فی صد مسلمان ہی تھے۔اس وقت ان کی روشن خیالی ظاہر ہوئی، یہاں تک کہ ایک مسلم نوجوان یہ کہہ رہا تھا کہ پردہ وغیرہ کیا چیز ہے؟ ہم تو اپنے بچوں کو آزادی دیں گے،جس سے چاہیں عشق کریں اور جس کو چاہیں اپنا(Life Partner) بنائیں۔

دوسری مثال:.....مراد آباد میں جہاں ہم رہائش پذیر ہیں، پڑوس میں ایک گھرانہ بستا تھا جو بظاہر دین دار بھی تھا،یعنی نماز وغیرہ کا پابند تھا،ان کے یہاں کی ایک لڑکی جو بی اے کی طالبہ تھی اسکول کے کسی پروگرام میں اس کو مختصر تقریر کرنی تھی یعنی (Mini Presentation) تھا۔اس نے خوش گمانی میں تصحیح کے لیے میری اہلیہ کے ذریعے میرے پاس اپنی لکھی ہوئی تقریر بھیجی،تو اس نے مساوات و یکجہتی پر اچھی باتیں لکھی تھیں،اس میں اس مفہوم کا جملہ بھی لکھا تھا کہ We are sons and daughters of one God یعنی ہم ایک ہی خدا کے بیٹے، بیٹیاں ہیں۔ یہ اس گھرانے کی بات ہے جہاں والدین اور خود لڑکیاں نماز کی پابند نہیں، بلکہ پڑوس کی بچیوں کو قرآنِ پاک بھی پڑھاتی تھیں۔ یہ ہے اسکول کی تعلیم کی زہرناکی جو معاشرہ میں بڑی تیزی سے پنپ رہی ہے۔ یہ ایک دو مثالیں ہیں،اگر تحقیق کی جائے تو اسکول میں تعلیم پانے والوں کی اکثریت اسی طرح کی ہوگی۔اس کا نمونہ عالمِ عرب میں بھی نظر آتا ہے، یہاں تک کہ سعودی عرب میں بھی یورپ و امریکہ کی بنا پر نئی نسل میں اباحیت پسندی کا زور ہے اور وہ وہاں وہ سب کچھ دیکھنا چاہتے ہیں جو مغرب میں دیکھ اور برت کر آئے ہیں۔

ایک حقیقت:.....اسکولوں کی خطرناکیوں اور زہرناکیوں کے باوجود اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس زمانہ میں اسکول کی تعلیم بھی بہت ضروری ہے، کیوں کہ نہ سارے لوگ مدارس میں پڑھ سکتے ہیں اور نہ ہی سرپرست حضرات پڑھا سکتے ہیں۔ مدارس میں چاہے جتنے طلبہ آجائیں مگر ان کی شرح اسکول کے طلبہ سے بہت کم ہی رہے گی۔تو کیا ایسے حالات میں بچوں کو اسکولوں میں جانے دیا جائے یا پڑھائی چھڑا دی جائے؟ ظاہر ہے پڑھائی چھڑانا تو دانش مندی نہیں ہوگی، کیوں کہ ایسا کرنا اپنے بچوں کو عصر حاضر کے قافلے سے پیچھے رکھنا ہوگا جس کا خمیازہ وہ آگے چل کر بھگتیں گے۔

اس کا فوری حل تو یہ ہوسکتا ہے کہ ابتدا سے ہی اپنے گھروں میں بچوں کی دینی تربیت کی جائے،اس کے لیے والدین

اور سرپرستوں کو بھی دین دار بننا پڑے گا اور ان کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے اتالیق واستاد بھی رکھنا پڑے گا۔ محلے کی مسجد میں اگر مکتب ہو تو بہت اچھا ورنہ مکتب چلانا ہوگا اور اسکول سے آنے کے بعد بچوں کو وہاں بھیجنا از حد ضروری ہوگا، تاکہ وہاں قرآن پاک پڑھ سکیں اور کچھ دعائیں اور دینی معلومات حاصل کرسکیں، اسی طرح گرمی کی چھٹیوں میں سمر کیمپ کے نام سے دینی تعلیم کا نظم کیا جائے اور بڑے بچوں کو جماعت میں بھیجا جائے، ورنہ ایمان کی خیر نہیں۔

علماء کی ذمے داری:.....ایک حل یہ ہے کہ اپنے اسکول کھولے جائیں، جن میں اسلامی اُصول سے متفق نصاب ہو، جیسا کہ بعض علماء نے اس کی طرف پیش رفت کی اور ایک اچھے اور مؤثر انداز میں وہاں تعلیم ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسے اسکول جگہ جگہ کھولے جائیں، بلکہ ان کا جال بچھا دیا جائے۔ اس کام کو بھی حقیقت پسندی سے دیکھا جائے اور پیش قدمی کی جائے۔ اس کام کے لیے بھی علماء کرام کی ضرورت ہے کیوں کہ اس انحطاط کے زمانے میں بھی عوام کا اعتماد اسی گروہ پر ہے۔ وہ علماء جو بڑے بڑے دارالعلوم چلا سکتے ہیں، جو کسی تحریک کو اُٹھاتے ہیں تو چند دنوں میں اس کو ملک گیر بنا دیتے ہیں، میں سمجھتا ہوں ان کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں، بس تھوڑی فکر کی ضرورت ہے، لوگوں کو ترغیب دینے کی ضرورت ہے اور کام کو ایک مشن کے طور پر لے کر چلنے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک قحط الرجال (باصلاحیت افراد کی قلت) کی بات ہے، تو میرے خیال میں یہ ٹال مٹول یا پیچھا چھڑانے والی بات ہے۔ عصری تعلیم یافتہ لوگوں میں اب بھی بہت سے لوگ دین دار مل سکتے ہیں جو آپ کے اشارے پر بخوبی یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ نیز قحط الرجال کی بات کرکے ذمے داری سے سبکدوشی نہیں ہوسکتی، بلکہ رجال سازی بھی علماء ہی کا کام ہے، جیسا کہ ہمارے اکابر نے کیا ہے۔

دینی اور دنیوی علوم کی ایک اور تقسیم:.....اسلام میں نیت کو بہت اہمیت حاصل ہے بلکہ اعمال کا دارومدار ہی نیتوں پر ہے، تو اس حیثیت سے بھی علوم کو تقسیم کرسکتے ہیں، اگر نیت اچھی ہے، علم حاصل کرنے کی غرض اللہ کی رضا ہے اور پیش نظر صرف آخرت ہے، دنیا طلبی نہیں ہے، تو وہ علوم بھی دین کا حصہ ہوں گے جو عموماً دنیوی اور عصری سمجھے جاتے ہیں اور اگر نیت اچھی نہیں ہے، تحصیل علم سے مقصود اللہ کی رضا نہیں، نہ آخرت پیش نظر ہے، بلکہ اس کی غرض دنیا کی طلب، جاہ ومنصب کی چاہت، بڑا بننے کا شوق اور اظہارِ تفوق ہے تو وہ علوم بھی دنیا بن جاتے ہیں جو خالص دین سمجھے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر کوئی سافٹ ویئر انجینئر (Sofware Engineer) اس لیے پروگرامنگ سیکھتا ہے کہ وہ کوئی اسلامی سافٹ ویئر بنائے گا، یا کوئی دینی ویب سائٹ لانچ کرے گا، تو اس کا کمپیوٹر سائنس (Computer Science) سیکھنا بھی دین ہی ہوگا، جیسا کہ کوئی ڈاکٹر اس لیے ڈاکٹر بنے کہ وہ غریبوں اور ضرورت مندوں کا مفت یا سستا علاج کرے گا، ان کا خون نہیں چوسے گا اور اپنے پیشے سے خدمت خلق کرے گا، تو یہ بھی دین ہی کہلائے گا۔ اسی طرح ہر علم اور پیشے کو نیت کی درستگی سے دین کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی عرض کر دینا مناسب ہے کہ ہمارے بہت سے علماء ودانشور جو یہ بات کہتے ہیں کہ دینی اور دنیوی علوم میں کوئی فرق نہیں ہے، نہ خیر القرون میں ان میں کوئی فرق تھا، سبھی علوم حاصل کیے جاتے تھے اور سب کا مقصد دین ہی کی سربلندی تھی، تو وہ بھی غالبًا اسی نیت والے پہلو ہی کو دیکھ کر یہ بات کہتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ ان علوم سے نہ تو قرآن وحدیث کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی دینی مسائل کا حل ان میں پاسکتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ثانوی درجے میں یا بالواسطہ دین ہو سکتے ہیں، لیکن اگر نیت درست نہیں ہے تو عصری علوم تو عصری ہی ٹھہرے، وہ علوم جن کا تعلق قرآن وحدیث سے ہے یا یہ کہہ لیجیے کہ خود قرآن وحدیث کا سیکھنا بھی دنیا بن جاتا ہے، اس کا تعلق پھر دین سے نہیں رہ جاتا، بلکہ وہ اللہ کی ناراضی اور جنت سے محرومی کا سبب بن جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ملاحظہ فرمائیں:

عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تعلّم علما مما يبتغى به وجه الله عزوجل لايتعلمه إلاليصيب به عرضا من الدنيا لم يجد عرف الجنة يوم القيامة يعنى ريحها۔"(سنن الترمذی: ٣٦٦٤)

''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ علم جس سے اللہ کی رضا چاہی جاتی ہے (یعنی دین اور کتاب وسنت کا علم) اگر اس کو کوئی شخص دنیا کی دولت کمانے کے لیے حاصل کرے تو قیامت میں جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہے گا۔''

یہی نہیں، بلکہ ایک حدیث میں جہنم کی وعید بھی سنائی گئی ہے۔ آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من تعلم علما لغير الله أو أراد به غير الله فليتبوا مقعده من النار۔"(سنن الترمذی: ٢٨٦٧)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کسی نے علم دین اللہ کی رضا کے لیے نہیں بلکہ غیر اللہ کے لیے (یعنی دنیوی اور نفسانی اغراض کے لیے) حاصل کیا، وہ جہنم میں اپنا ٹھکانا بنالے۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی علوم اصلاً قرآن وحدیث ہی کا علم ہے، باقی علوم اگر نیت صحیح ہو تو باعث اجر وثواب ہیں، ورنہ نرے دنیا ہیں، اسی طرح اگر نیت درست نہیں ہے تو قرآن وحدیث وفقہ کا علم بھی وبالِ جان ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو علم نافع اور اپنی رضا عطا فرمائے۔ (آمین)

☆.....☆.....☆

اُردو کا ملّی تشخص اور کردار

پروفیسر غازی علم الدین

زبان اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔[1] انسانی شخصیت میں یہ ایک اہم مظہر کی حیثیت رکھتی ہے۔ زبان نہ ہوتی تو نہ شعر ہوتا نہ فلسفہ، نہ سائنس ہوتی نہ نت نئی ایجادات، نہ انسان صحیح معنوں میں خدا کو پہچانتا نہ خود اپنی انسانی نسل کے بھائیوں اور بہنوں کو۔ یہ حقیقت ہے کہ اچھی زندگی ہمیں زبان کے طفیل نصیب ہوئی ہے۔ قوّتِ تکلّم انسانی شرف کا ایک امتیازی وصف ہے۔ یہ قوّت اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ بعض اوقات اسے واحد امتیازی وصف کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ نطق یعنی قوت گویائی انسان اور حیوان کی ہم نوعی کے باوصف واحد وجہِ امتیاز قرار پاتی ہے۔ زندہ انسان اور زندہ زبان میں اس قدر قریب کی مشابہت ہے کہ کسی زبان کو ''زندہ'' یا ''مردہ'' کہنا مجازی طور پر ہی نہیں، لغوی طور پر بھی درست معلوم ہوتا ہے۔ مسلسل حرکت اور رنگا رنگی میں بھی یہ دونوں ایک دوسرے کے مثیل ہیں۔ قوّت تکلّم کی اس اہمیت کے پیشِ نظر ہر مذہب نے اس کی تہذیب واصلاح کو اپنی تعلیمات کا حصہ بنایا ہے۔ اسلام ہمہ گیر راہ نمائی کا مدّعی ہے اس لیے قوتِ اظہار کے اس شرف پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ ذکرِ الٰہی جو قلب ونظر کا اطمینان[2] ہے زبان ہی کا وظیفہ ہے اور ''حَصَائِدُ اَلْسِنَہ''[3] اسی قوتِ اظہار کے غیر مناسب استعمال کو کہا گیا ہے۔

جس طرح انسان ابتداء ہی سے اپنے گرد پھیلی ہوئی کائنات پر غور وفکر کر رہا ہے اسی طرح اس کے اندر پھیلی ہوئی کائنات بھی اس کی توجہ کا مرکز ہے جس کے عجائبات گوناگوں اور اسرار لامتناہی ہیں۔ زبان بھی انھی اسرار میں سے ایک ہے۔ یہ بنیادی سوالات ہمیشہ ہی سے موضوعِ بحث رہے ہیں کہ روئے زمین پر انسان کب سے آباد ہے اور کیا انسانی زبان کی اصل ایک ہی ہے؟ اس کی ابتداء کیسے ہوئی اور کیسے پھیلی؟ اور پھر اس میں تغیرات کس طرح سے آئے؟ زبانوں کے کتنے خاندان ہیں اور کون کون سی زبانیں کس کس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں؟ لہجے کیسے وجود میں آئے، معاشرہ کا زبان پر اور زبان کا معاشرہ پر کیا اثر پڑتا ہے؟ معاشرے کے مختلف طبقات کی زبانوں میں فرق کی نوعیّت کیا ہے؟ انسانی

زبان اور فکر کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

زبان کے عناصرِ ترکیبی کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''زبان کا استقلال اور آئندہ کی زندگی چار ستونوں کے استقلال پر منحصر ہے، قوم کا ملکی استقلال، سلطنت کا اقبال، اس کا مذہب اور تعلیم و تہذیب۔ اگر یہ چاروں پاسبان پورے زوروں سے قائم ہیں تو زبان بھی زور پکڑتی جائے گی۔ ایک یا زیادہ جتنے کمزور ہوں گے اتنی ہی زبان ضعیف ہوتی جائے گی یہاں تک کہ مر جائے گی۔''(۴)

ہر زبان کے ساتھ متعلقہ قوم کی تہذیب و تمدن اور تاریخ و روایات وابستہ ہوتی ہیں۔ ہر ملک کی قومی زبان اس کے قومی تشخص کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ قومی زبان اور قومی تشخص میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں اردو زبان و ادب کے ملّی تشخص اور کردار کی نسبت جائزہ لیا جائے گا۔ اس تحریر سے میری یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ اردو کے فروغ و اشاعت میں صرف اور صرف مسلمانوں نے ہی کام کیا ہے اور دوسری قوموں نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔ رتن ناتھ سرشار، مالک رام، نول کشور، منشی پریم چند، ہری چند اختر، تلوک چند محرومؔ، پنڈت دیا شنکر نسیم، سری رامؔ، چکبست، کرشن چندر، رام بابو سکسینہ، منشی تیرتھ رام فیروز پوری، دیوان سنگھ مفتون، فراق گورکھپوری، گیان چند، آنند نرائن ملّا، راجندر سنگھ بیدی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مسز سروجنی نائیڈو کی اردو زبان و ادب کے بارے میں خدمات سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے؟ لیکن امرِ واقع یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوششیں تمام قوموں سے بڑھی ہوئی ہیں جس کی وجہ یہ تھی کہ کسی دوسری قوم نے اس زبان کو من حیث القوم نہیں اپنایا کیوں کہ ان کے پاس وسیلۂ اظہار کے لیے دوسری دیسی زبانیں بھی موجود تھیں جنھیں انھوں نے وقتاً فوقتاً استعمال بھی کیا ہے، لیکن مسلمانوں نے من حیث القوم ہندوستان کی سینکڑوں زبانوں میں سے صرف اسی ایک زبان پر قناعت کی اور اپنے خیالات کے اظہار کا واحد، بھرپور اور مؤثر وسیلہ بنایا۔

اسلام ایک طریقِ حیات ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ عربی زبان اسلامی احکامات کی امین ہے۔ اس لیے اس میں زندگی کے تمام شعبوں کے لیے کلمات و مفردات کا ایک بحرِ زخار موجود ہے۔ جس نسبت سے یہ کلمات برصغیر کی مقامی زبانوں میں داخل ہوتے گئے اُسی نسبت سے ان کا عربی زبان سے قرب بڑھتا گیا۔ یہ اس اثر پذیری کا نتیجہ تھا کہ مقامی زبانوں میں عربی زبان کا لسانی بُعد ختم ہونے لگا اور آخر وہ وقت آیا کہ مسلم ہند کی زبان بھی مشرف با اسلام ہوگئی۔ اردو جو اسلامی ثقافت کی زندہ مثال ہے، عربی اثرات کا نتیجہ ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ عربی زبان نے اردو کی ساخت و پرداخت میں مادرانہ کردار ادا کیا ہے۔ اردو کے علاوہ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، بنگلہ، کھڑی بولی اور دیگر تمام زبانوں کا اِحصاء کیا جائے اور ان کے مفردات کا مآخذ تلاش کیا جائے تو سینکڑوں نہیں ہزاروں الفاظ عربی الاصل نکلیں گے۔ عربی زبان و ادب سے رابطے اور دینِ اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں کثیر تعداد ان علماء و ادباء کی سرگرمِ

عمل نظر آتی ہے جو برصغیر کی کوکھ سے پیدا ہوئے مگر عرب تہذیب وتمدن کو اپنانے لگے اور دینِ اسلام کی تشریح وتوضیح میں اپنی زندگیوں کو وقف کیے رہے۔ یہ ان اربابِ علم کی محنت کا ثمر ہے کہ برصغیر پاک وہند کے عوام اپنے دین سے محبت کرنے والے ہیں اور تہذیبی وتمدنی اقدار کے حوالے سے اپنے عرب بھائیوں سے بہت قریب ہیں۔''(۵)

برصغیر پاک وہند میں ہزار سالہ اسلامی حکومت کا سب سے اہم اور عظیم الشان کارنامہ مقبولِ عام زبان اردو کی تشکیل ہے۔ اردو کی تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی حیثیت متعیّن کرتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''اردو ہماری گزشتہ عروجِ عظمت کی تنہا یادگار یا سوگ وار ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف اردو کی بنیاد رکھی بلکہ اس کی تمام تدریجی اور ارتقائی منازل میں اِنھیں کا ذہن و دماغ کارفرما رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کی معاشرت، ان کی ذہنی اور دماغی ترقی کی تنہا حامل ہے۔ کسی قوم کی زبان اس کی قومی حیثیت کی علم بردار ہوتی ہے۔ کسی قوم کے اوّلین آثارِ انحطاط کا مطالعہ کرنا ہو تو اس قوم کی زبان پر نظر ڈالیے۔ آپ پر یہ حقیقت جلد منکشف ہو جائے گی کہ قومی زوال کی ابتداء ہمیشہ زبان کے زوال سے ہوئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے اثر سے تشخصاتِ ملّی تک فنا ہو گئے ہیں۔''(۶)

برصغیر کی زبانوں پر عربی و فارسی زبانوں کے براہِ راست اثرات اسی وقت سے شروع ہو گئے تھے جس وقت مسلمانوں نے ہندوستان میں قدم رکھا۔ ان زبانوں میں رفتہ رفتہ عربی و فارسی کے الفاظ غیر شعوری طور پر داخل ہونے لگے جن کے وجود کا علم ہمیں اس وقت کے دیسی ادب کی ورق گردانی سے ہوتا ہے۔ ان اثرات کو قبول کرنے میں اردو زبان بھی اپنی دوسری معاصر زبانوں کے برابر کی شریک تھی۔ برصغیر میں بسنے والے مسلمانوں نے جب اردو کو اپنے لیے چن لیا تو اس میں عربی و فارسی کے دخیل الفاظ کا حصہ بھی زیادہ ہو گیا۔ مسلمان اپنا ایک جداگانہ مذہبی نظام اور ایک مخصوص فلسفۂ حیات لے کر آئے تھے اور اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کے لیے خاص الفاظ اور اسالیبِ بیان کے ساتھ ساتھ مذہبی رسوم وعبادات وغیرہ کے لیے توحید، رسالت، صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ، نماز اور روزہ جیسی کثیر تعداد اصطلاحات کا ذخیرہ بھی رکھتے تھے جسے انھوں نے اردو زبان میں بجنسہٖ منتقل کر دیا۔ اس سے جہاں اردو بولنے والے مسلمانوں کو اپنی مذہبی تعلیم و تبلیغ میں مدد ملی، وہاں اردو زبان کا دامن بھی وسیع ہو گیا۔(۷)

برصغیر کے مسلمانوں کی اپنی سماجی زندگی کا ایک خاص نہج تھا اور زندگی کے کچھ رسوم ورواج اور کچھ تقاضے بھی تھے۔ پیدائش، شادی بیاہ اور موت کی تقریبات، ختنہ، عقیقہ اور نذر نیاز کے طریقے اور نشست و برخاست کے قرینے تھے۔ وہ بعض ایسے کھانے کھاتے آئے تھے، بعض ایسے لباس پہنتے آئے تھے اور بعض ایسی اشیاء (ظروف اور فرنیچر وغیرہ) استعمال کرتے آئے تھے جن کی وضع قطع اور جن کے نام ہندوستان کے لیے بالکل نئے تھے۔ بعض ایسے قصے اور بعض ایسے واقعات کی یادیں تھیں جو ان کے ماضی اور وطنِ قدیم سے متعلق تھے اور جن سے اردو زبان اب تک بالکل نا آشنا

تھی، اس لیے ان کے یہ سب نام اور یہ سب تلمیحات انھیں جوں کی توں اس زبان کے سپرد کرنا پڑیں تا کہ وہ ان کی یومیہ زندگی کی بھرپور کفالت کر سکے اور ان کے خواب اور بیداری کی مکمل طور پر امین بن جائے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنی ظاہری و باطنی اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی اور ترجمانی کی اہل بنانے کے لیے اردو زبان کو عربی و فارسی کے کثیر تعداد الفاظ، اصطلاحات، محاورات، تلمیحات اور اسالیبِ بیان عطا کر دیے۔ یہ بات صرف اردو زبان تک ہی ختم نہیں ہوئی بلکہ ان کوششوں کا سلسلہ اردو ادب تک بھی پہنچا اور وہ اس طرح کہ عربی و فارسی کا تمام عروض اردو میں منتقل کر لیا گیا۔ عربی و فارسی زبان کی تمام بحریں اردو نظم میں استعمال کی گئیں۔ مختلف اصناف مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ کا اضافہ کیا گیا۔ شعری تنقید کا انداز مستعار لیا گیا۔ اصلاحِ زبانِ اردو کی جو کوششیں آج تک اساتذۂ اردو نے کی ہیں ان میں دیسی الفاظ کو کم کرنے اور عربی و فارسی الفاظ کو رائج کرنے پر پوری قوت صرف کی گئی۔ عربی و فارسی محاورات کا ترجمہ کرنے کی کوشش تو بہت سے شاعروں نے کی ہے۔ یہ سب کچھ اردو کو اس برصغیر میں عربی و فارسی کے حقیقی جانشین بنانے کے لیے کیا گیا کیوں کہ مسلمانوں کو ان زبانوں سے پیار ہے۔ مسلمانوں نے اردو کو اپنانے کے لیے عربی و فارسی میں موجود قریب قریب پورا مذہبی سرمایہ اس زبان میں منتقل کر دیا۔ مسلمان علماء نے قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ کیا اور تفاسیر لکھیں۔ قرآن و حدیث، فقہ، سیرت، تصوف، اسلامی فلسفے اور تاریخ کے سرمائے کو اردو میں منتقل کیا۔ سیرت پاک پر سینکڑوں کتابیں اردو میں لکھی گئیں۔ بزرگانِ دین کی سوانح عمریاں اور مسلمانوں کی تاریخیں نہ صرف ترجمہ ہوئی ہیں بلکہ اردو میں بھی خود نئے سرے سے لکھی گئی ہیں۔ اس قدر وافر مذہبی سرمائے کا وجود یہ ثابت کرتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اردو زبان کو اپنے لیے منتخب کر کے اپنی پوری کی پوری متاعِ عزیز اسے سونپ دی ہے۔ (۸)

اردو زبان اپنی خصوصیات کی بنا پر جس درجہ ممتاز ہے اس کی مثال برصغیر پاک و ہند کی کوئی دوسری زبان پیش نہیں کر سکتی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دیسی زبانوں میں سے اردو ہی وہ اکیلی زبان تھی جسے اکبر راج میں اس کے محل والوں نے اپنا لیا تھا، جسے شاہ جہاں نے ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچا دیا تھا اور جسے ۱۸۳۲ء میں انگریزوں نے فارسی کی جگہ سرکاری زبان بھی بنا دیا تھا۔ یہی زبان آج پورے برصغیر کی لمبائی چوڑائی میں سب زبانوں سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ اس میں جتنا اسلامی ادب موجود ہے اتنا عربی و فارسی میں بھی مشکل سے مل سکے گا۔ اردو میں جو کچھ مواد اسلامی علوم اور عربی و فارسی زبان و ادب سے متعلق موجود ہے اس کی تہ میں مسلم ہند کی تاریخ اور تہذیب کے معتبر شواہد ملیں گے۔ مسلمانوں کے قیامِ حکومت کے ساتھ ہی ہندوستان اسلامی علوم کا بڑا مرکز بن گیا۔ لاہور، ملتان، دہلی، گجرات اور لکھنؤ وغیرہ مراکز ایسے تھے جہاں ہندوستان اور بیرون ہند کے علماء و فضلاء علوم کی تحقیق و تدقیق میں مصروف ہوئے۔ یہ روایت صدیوں تک قائم رہی۔ اسی وجہ سے دہلی جو دارالسلطنت تھا، اس نے علمی اور تہذیبی ترقی کے اعتبار سے بغداد اور قرطبہ کو بھی دھندلا کر دیا۔ یہاں کے علماء کی تصانیف کا معیار کسی بھی ملک کی تصانیف سے کم نہیں۔ یہاں کے علماء کی فکری روایت بیرونِ ہند علماء کی

فکری روایت سے بہت مستحکم رہی ہے۔ گزشتہ دور کے چند صاحبِ فکر بزرگوں جن میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی، علامہ اقبال، سیّد سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ابوالحسن علی ندوی وغیرہ ممتاز ہیں، ان کی تصانیف کا مقابلہ اسلامی ممالک کے کسی عالم کی تصانیف سے کرلیں تو معلوم ہوگا کہ ان کی اسلامی تفکیر کا کیا مرتبہ ہے۔

اسلامی ہند میں اردو کے فروغ کے حوالے سے ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

''نئی زبان (اردو) میں اس شدید قسم کی کشش تھی کہ اس نے جلد ہی عوام میں قبولیت کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔ پھر مسلمان صوفیہ نے اس زبان کے ذریعے اسلام کو پھیلانا شروع کیا تو یہ اور بھی مقبول ہوگئی۔ یہاں تک کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک یہ ایک ادبی و علمی زبان کی حیثیت اختیار کرگئی اور ملک کے ہر صوبے اور ہر شہر میں سائنسی اور ادبی انجمنیں اردو کے نام سے کام کرنے لگیں لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں اردو کی یہ مقبولیت انتہاء پسند ہندوؤں کو انتہائی ناگوار گزری۔''(۹)

زبان اور رسم الخط کا تعلق بھی روح اور قالب سے کم نہیں۔ رسم الخط تلفظ کا تابع ہوتا ہے اور اس کا ہر حرف ایک جداگانہ آواز کی نیابت کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ابتداءً زبان صرف اصوات کا نام ہوتا ہے اور اشکال ثانوی حیثیت رکھتی ہیں لیکن حروف یعنی الفاظ کی تحریری شکلیں بھی اتنی ہی اہم ہوتی ہیں جتنی کہ ان کی آوازیں۔ زبان اور رسم الخط کا مکمل اور مناسب اجتماع و امتزاج زبان کو زندہ اور پائندہ بناتا ہے اس لیے کسی زبان کو اس کے رسم الخط سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ زبان رسم الخط کے بغیر مکمل نہیں ہوتی بلکہ ادھوری رہتی ہے۔ جس زبان کا اپنا رسم الخط نہ ہو اس کا دامن علم وادب کے خزانوں سے تہی رہ جاتا ہے۔ جس طرح روح اور جسم ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں، بالکل اسی طرح زبان اور رسم الخط کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اردو اور اس کے رسم الخط سے ہمارا رشتہ بہت قدیم ہے۔ اردو صرف زبان کا نام ہی نہیں بلکہ ایک تہذیبی علامت بھی ہے۔ برصغیر میں اردو ہندی تنازع کا اصل محرک رسم الخط کی تبدیلی تھا۔ ہندو اردو زبان کے لیے دیوناگری رسم الخط رائج کرنا چاہتے تھے۔ اگر ایسا ہوجاتا تو برصغیر کے مسلمانوں کو ان کے شاندار ماضی، معاشرتی روایات اور تہذیبی وثقافتی سرمائے سے دست بردار ہونا پڑتا۔ اردو زبان کو قرآنی حروف کا لباس عطا کردینے کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان بستے تھے وہ اپنے علاقے کی مقامی بولی بولتے ہوئے بھی اردو زبان کو اپنی تحریر کے لیے استعمال کرنے لگے کیوں کہ عربی رسم الخط سے مسلمانوں کی عقیدت بالکل فطری تھی۔ اس لیے اردو کا دائرہ اثر اس قدر وسیع ہوا کہ برصغیر کے گوشے گوشے میں اس کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پشاور سے ڈھاکا اور کشمیر سے راس کماری تک اس کے بولنے اور سمجھنے والے پیدا ہوگئے۔ چناں چہ اردو کی نشر واشاعت میں اسلامیانِ ہند کی کوششوں کو جتنا دخل ہے اس سے اردو زبان کا کوئی مؤرخ انکار نہیں کرسکتا اور نہ اس حقیقت کو چھپا سکتا ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال پر مسلمانوں ہی کے ہاتھوں اطرافِ ہند میں اردو زبان کے مختلف مراکز قائم ہوئے جن سے رفتہ رفتہ ترویج اُردو کی صوبہ

جاتی تحریکوں نے جنم لیا اور گُل ہند انجمن ترقیٔ اردو کے علاوہ متعدد چھوٹے چھوٹے اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ (۱۰)

اردو رسم الخط اپنی ایک مبسوط تاریخ رکھتا ہے۔ رسم الخط قوموں کے لسانی مزاج کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس سے ایک قوم کے مخصوص تہذیبی نقوش کا پتا چلتا ہے۔ زبان اور رسم الخط کی اہمیت اس حوالے سے دوچند ہوجاتی ہے کہ یہ دونوں (زبان اور رسم الخط) قوموں کی تہذیبی اساس کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے کا سبب ہیں۔ تہذیب وثقافت کی تشکیل وتزئین اور فروغ وارتقاء میں زبان کچھ نہ کچھ کردار ضرور ادا کرتی ہے۔ ہر رسم الخط صوتی ادائی کا عکاس ہوتا ہے۔ اس کی معرفت ہی سے آوازیں ادا ہوسکتی ہیں۔ موجودہ رسم الخط عربی وفارسی اور اردو کی آوازوں کا آلۂ اظہار ہے۔ اردو کا موجودہ رسم الخط دنیائے اسلام کا رسم الخط ہے جس سے ہمارے دینی رشتوں کی اساس مضبوط ہوتی ہے۔ اردو رسم الخط دل آویز ہے جو ایجاد اور اختراع کے نئے نئے پہلوؤں سے مزین ہے۔ اس میں تخلیقی صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس رسم الخط کو اس کے لکھنے والوں نے اپنی جدّتِ طبع اور رنگینیٔ قلم سے مصوّری کا درجہ عطا کردیا ہے۔

جب تک اردو زبان دیوناگری میں قلم بند ہوتی رہی، ہمالیہ کی فصیل پار نہ کرسکی لیکن عربی وفارسی رسم الخط میں منتقل ہونے کی دیر تھی کہ اسے ہندوستان کی سرحدوں کو پھلانگ کر ایران وعربستان کی زبانوں اور ان کے بولنے والوں سے تعارف وملاقات کا موقع بھی ہاتھ آ گیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ دیوناگری کے حصارِ آہنی میں قید رہنے والی زبان کو مسلمانوں کی بدولت آزادی نصیب ہوئی اور اُسے وہ پَر پرواز مل گئے جن کے زور پر وہ آج دنیا کی زبانوں میں تیسرے نمبر پر شمار ہونے لگی ہے۔ چناں چہ ہندوستان سے باہر اردو کی ترویج واشاعت بھی اس کے قرآنی رسم الخط کا ہی اعجاز تھا جس کے احسان سے یہ زبان تاقیام قیامت سبک دوش نہیں ہوسکتی۔ (۱۱)

فورٹ ولیم کالج وہ واحد ادارہ تھا جہاں سب سے پہلے پنڈت للولال جی نے اردو ہندی تنازع کا آغاز کیا۔ انگریزوں کی پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' اُن کے روزِ اوّل سے ہی کارفرما تھی۔ چناں چہ آہستہ آہستہ انگریز نے نسلی، لسانی، مذہبی، فرقہ جاتی اور علاقائی تعصّب کو بھڑکایا اور خاص طور پر علیحدہ خطہ، تہذیب وثقافت اور تمدّن وکلچر کے موضوع پر کتابیں لکھوائیں جنھوں نے ان تمام قسم کے تعصّبات کو بھڑکانے میں شعلۂ جوالہ کا کام کیا۔ ہندی زبان کو فورٹ ولیم کالج نے خاص وجوہات کی بنا پر ترتیب دیا۔ مشرقی زبانوں کے شعبے میں عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو شامل تھیں۔ ڈاکٹر جان گِل کرِسٹ اس کے صدر تھے۔ برطانوی افسروں کو مقامی زبان کی تعلیم کے لیے مصنفین اور مترجم مسلمان اور ہندو تھے۔ یہ کتابیں فارسی رسم الخط (نستعلیق) میں شائع کی گئیں۔ ایک ہندو مترجم للولال جی نے، جو گجرات کا برہمن تھا، بھگوت گیتا کا ترجمہ ''پریم ساگر'' کے نام سے کیا لیکن اس میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی کہ فارسی اور عربی الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ برج بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ شامل کیے گئے اور فارسی رسم الخط کی بجائے دیوناگری رسم الخط میں لکھا گیا۔ اس کام پر مصنف کی بہت تعریف کی گئی کیوں کہ اس طرح ایک نئی زبان، جسے ہندوؤں کی زبان کہا جاسکے، کا راستہ کھل گیا

تھا۔ ''پریم ساگر'' کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا اور بعد میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس نئی طرزِ تحریر کا، جسے ہندی کا نام دیا گیا، پہلے کوئی وجود نہ تھا۔ ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں:

''جدید ہندی کا اس وقت کوئی وجود نہ تھا کیوں کہ اس زبان میں پہلے کوئی لٹریچر نہ تھا۔ پہلی دفعہ اسے بطور ادبی زبان کے استعمال کیا گیا تھا۔ کالج کے پروفیسروں نے للولال جی کی اس زبان میں، جس میں اردو لکھی جاتی تھی، کتابیں لکھنے کی حوصلہ افزائی کی۔ البتہ اس میں فارسی اور عربی الفاظ کی جگہ سنسکرت الفاظ استعمال کیے گئے۔ یہ نئی زبان ہندوؤں کی ضرورت کے مطابق خیال کی گئی۔ پھر اس میں عیسائی مشنریوں نے بائبل کا ترجمہ کر کے اسے مقبول بنایا۔ نیا انداز جسے ہندی کہا گیا اسے مقبول ہونے میں کافی عرصہ لگ گیا۔ درحقیقت جدید ہندی ۱۸۵۷ء کے بعد ہی اس قابل ہوسکی کہ لوگ اس پر توجہ دیں۔ صوبائی گورنر لوگوں کو اردو زبان کے استعمال سے منع کرتے اور ہندی کی ترغیب دیتے کیوں کہ برطانوی حکومت ہندی کی ترویج میں بہت دل چسپی رکھتی تھی۔ اس طرح ہندی کے فروغ سے ہندو قومیت کو تقویت ملتی تھی۔'' (۱۲)

ہندوؤں کو اردو زبان اس لیے گوارا نہ تھی کہ اس کا ظاہری پیکر فارسی اور عربی تھا اور وہ مہاتما گاندھی کے بقول قرآن کے حروف اور اسلوب کا مالک تھا۔ یہ بات تکلیف دہ تھی کہ اردو ابجد کی شکل قرآن کی زبان سے ملتی جلتی تھی۔ قرآن کے آثار باقی اور جاری رہنا گویا مسلمانوں کو باقی رکھنے کی گنجائش پیدا کرنا تھا۔ شیخ محمد اکرام ہندوؤں کی اردو سے مخالفت اور ناگواری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''زبان وادب کے معاملات میں بھی ہندو تہذیب کے احیاء کے حامیوں کا رویہ اس سے کم امتیازی نہیں رہا ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں 'فورٹ ولیم کالج' میں للولال جی اور اُن کے ساتھیوں نے نئی ہندی اس طرح ''پیدا'' کی کہ اردو زبان سے تمام عربی اور فارسی کے الفاظ نکال دیے اور سنسکرت اور ہندی مآخذ کے الفاظ شامل کر لیے۔ (۱۳) یہی وہ رویہ تھا جس نے ان عوامل کو جنم دیا جس کا نتیجہ ہندوستان کی تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مہاتما گاندھی جیسے نام ور انسان بھی اردو کی ثقافتی اہمیت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔ ۱۹۴۰ء میں ناگ پور میں ہندی ساہتیہ سملین کے اجلاس میں انھوں نے کہا ''اردو کو مسلمان بادشاہوں نے ترقی دی۔ اب یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اس کی پرورش کریں''۔ (۱۴)

اردو ہندی تنازع کے پسِ پردہ کئی مقاصد تھے۔ یہ تنازع بیک وقت مسلمانوں کے مذہب اور ثقافت پر ادبی میدان میں ایک بھرپور حملہ تھا۔ عربی کے الفاظ کے اخراج سے مسلمانوں کے مذہب کو نقصان پہنچانا مقصود تھا اور فارسی الفاظ کو خارج کرنے سے مسلمانوں کی تہذیب وثقافت اور ادب برائے زیست کو برصغیر سے رخصت کرنا مقصود تھا۔ مسلمانوں کی تہذیب کو ختم کر کے ہندو تہذیب وثقافت کو فروغ دے کر سیاسی بالادستی حاصل کرنا تھا۔ رسم الخط کے بدلنے سے مراد

مسلمانوں کو جہالت کی تاریکیوں میں دھکیلنا مقصود تھا کہ وہ فکری طور پر منجمد ہوجائیں۔ اردو برصغیر میں مسلمانوں کی ثقافت کی زبان تھی۔ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ اس کا ارتقاء برصغیر میں مسلمانوں کی آمد اور قیام کا مرہون منت تھا۔ یہ آہستہ آہستہ ترقی کر کے پورے برصغیر میں رابطے کی زبان کی حیثیت اختیار کر گئی۔ جب یہاں انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو ان کے لیے بھی اسے رابطے کی زبان تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ چناں چہ ۱۸۳۵ء میں فارسی کی جگہ اردو کو عدالتی زبان بنا دیا گیا۔ گویا یہ اقدام مسلمانوں کی ثقافتی اور سیاسی حیثیت کو تسلیم کرنے کے مترادف تھا۔ یہ بات ہندوؤں کو پسند نہ آئی۔ ہندوؤں نے دیکھا کہ انیسویں صدی کے پہلے ربع میں شاہ عبدالقادر دہلوی کے اردو زبان میں سادہ ترجمۂ قرآن کو بہت مقبولیت حاصل ہو رہی ہے تو وہ جل بھُن گئے۔ بنگال اور بہار میں تبلیغی، اصلاحی اور علمی رسائل و کتب کی اشاعت پر وہ مزید سیخ پا ہو گئے۔ ہندوؤں کو یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ اردو کے ذریعے مسلمان اپنے دین اور اپنی روایات کے تحفظ کا اہتمام کر رہے ہیں لہٰذا انھوں نے اردو کو بھی مسلمانوں کی طرح ملیچھ قرار دے دیا۔

۱۸۶۷ء میں یوپی کے ہندوؤں نے اردو کے خلاف تحریک چلائی اور مطالبہ کیا کہ اردو کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جائے اور دیوناگری رسم الخط کو سرکاری حیثیت دی جائے۔ اس تحریک کا بنیادی محرک اردو دشمنی اور ہندو ثقافت کی بالادستی منوانا تھا۔ سرسیّد احمد خان کے لیے یہ صورتِ حال پریشان کن ثابت ہوئی۔ سرسیّد ابتداء میں متحدہ قومیت کے قائل تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو خوب صورت دوشیزہ کی دو آنکھیں سمجھتے تھے لیکن ۱۸۶۷ء میں بپا ہونے والے ہندی اردو تنازع نے ان کے خیالات میں بنیادی تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ متحدہ قومیت کے مخالف اور دو قومی نظریے کے زبردست حامی اور مبلّغ بن گئے۔ انھوں نے ہندوؤں کے مستقبل کے ارادوں کو بھانپ لیا۔ چناں چہ انھوں نے اس بات پر زور دینا شروع کر دیا کہ مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ قوم ہیں، انھیں اپنے مستقبل پر غور کرنا چاہیے۔ ان کا تعلیمی پروگرام اسی فکر کی ایک کڑی تھا۔ معروف بھارتی مسلم دانش ور اور بھارتی پارلیمنٹ کے سابق رکن ڈاکٹر رفیق زکریا لکھتے ہیں:

> ''ہندی اردو قضیہ دراصل ہندو اور مسلم دانش وروں کے مابین چھڑنے والی لڑائی تھی۔ اگرچہ بنیادی طور پر یہ ایک لسانی قضیہ تھا لیکن اس کی وجہ سے دونوں فریقوں کے جذبات اس حد تک مشتعل ہو گئے تھے کہ ان کے مابین پائے جانے والے تعلقات پر شدید اور دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ مسلم سیاست پر اس کا نہایت ہی واضح اثر ہوا۔ اس کی وجہ سے وہ تمام تعلیم یافتہ مسلمان جو پہلے ہی سے نئی ابھرنے والی ہندو قیادت کے تعلق سے شکوک اور شبہات میں مبتلا تھے اس بار شدت کی ساتھ اپنے مستقبل کے تعلق سے خطرہ محسوس کرنے لگے۔ سرسیّد احمد خان نے تو اس سے بہت پہلے ۱۸۶۷ء ہی میں اپنے اعلیٰ عہدے دار مسٹر شیکسپیئر سے کہہ دیا تھا کہ ہندی کی حمایت کرنے والے ہندوؤں کی اردو مخالف تحریک کے بعد ہی انھیں

اس کا یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کی جانب سے کسی مشترکہ عمل کی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔ لہٰذا اب مسلمانوں کو خود ہی منظّم ہو کر اپنے قومی اثاثے کی حفاظت کرنی ہوگی۔''(۱۵)

۷/نومبر ۱۸۷۱ء کو گورنر بنگال نے بھاگل پور سائنٹفک سوسائٹی کے اجلاس میں شرکت کی۔ اس موقع پر مولوی امداد علی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال کیے۔ بہاری تو پہلے ہی سے موقع کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے گورنر کو ''غیر ملکی'' زبان کی بجائے مقامی زبان کے اجراء کا مشورہ دیا۔ چناں چہ گورنر نے صرف اردو زبان کی مذمت کرتے ہوئے اسے ''غیر ملکی'' زبان قرار دیا بلکہ وہ اردو کو نقصان پہنچانے کے اس قدر درپے ہو گیا کہ اس نے محکمہ تعلیم کو اردو کی نصابی کتب کی ممانعت کا حکم جاری کر دیا۔ گورنر کے اس فیصلے کو حکومت کے دیگر اعلیٰ عہدے داروں نے ناپسند کیا۔ کلکتہ کے نیم سرکاری اخبار ''دی انگلش مین'' نے بھی گورنر کے اس فیصلے پر نقطہ چینی کی۔(۱۶)

۱۸۸۲ء میں ''ہنٹر ایجوکیشن کمیشن'' کی تشکیل کے موقع پر ہندوؤں کو دوبارہ اردو زبان کو نقصان پہنچانے کا موقع میسر آیا۔ اس بار یہ فتنہ پنجاب اور یوپی میں اٹھا جہاں انجمنوں اور سوسائٹیوں نے کمیشن کو اردو کے خلاف لاتعداد میموریل پیش کیے۔ ایک مرتبہ پھر سر سیّد اردو زبان کی حفاظت کے لیے آگے بڑھے اور ہنٹر کمیشن کو یہ باور کرانے میں کام یاب ہوئے کہ یہ مسئلہ لسانی کی بجائے سیاسی رنگ اختیار کر چکا ہے۔

مارچ ۱۸۹۸ء میں یوپی کے متعصب گورنر اینٹونی میکڈانل کو یوپی کی عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں ہندی اور ناگری رسم الخط کے اجراء کے متعلق ایک عرض داشت پیش کی گئی۔ میکڈانل مسلمانوں کے بارے میں سخت متعصب تھا اور اسے مسلمانوں سے غداری کی بو آتی تھی۔ اسی سبب اس نے گورنر جنرل کو لکھا کہ ''مسلمان برطانوی سلطنت کے لیے خطرہ ہیں اور ان کی سرکاری ملازمتوں میں مضبوط پوزیشن کو سیاسی طور پر جہاں تک ممکن ہو ختم کیا جائے۔'' لہٰذا اس نے مسلمانوں کو زک پہنچانے کی خاطر نہ صرف یوپی کی عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں اردو کے علاوہ ناگری رسم الخط جاری کرنے سے متعلق ۱۸/اپریل ۱۹۰۰ء کو ایک حکم جاری کیا بلکہ یہ بھی حکم دیا کہ آئندہ سے دفاتر میں مختلف آسامیاں پُر کرتے وقت صرف انھی لوگوں کو مقرر کیا جائے جو فارسی اور ناگری رسم الخط دونوں سے واقف ہوں۔(۱۷) اُردو دشمنی میں سر اینٹونی میکڈانل کی ہندوؤں سے ہم نوائی ہندوستان کے مستقبل، ہندو مسلم اتحاد اور مسلمانوں کی زبان، ثقافت اور علمی ورثے کے لیے خطرناک تھی۔ چناں چہ ''مسلم کرانیکل'' اس بارے میں یوں لکھتا ہے:

''یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ حالیہ برسوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین پائے جانے والے تعلقات میں کوئی شے کشیدگی کا اس قدر باعث نہیں بنتی جتنی کہ وہ فاش غلطی جو زبان کے مسئلے میں سر اینٹونی میکڈانل سے سرزد ہوئی ہے۔''(۱۸)

یوپی کے مشہور متعصب وزیر تعلیم مسٹر سمپورنانند نے اپنی اردو دشمنی کا بڑا سبب یہ بتایا تھا کہ ''جب میں گھر گیا تو میری

لڑکی نے بھگوان کے بجائے خدا کہا'' اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ''خدا کی طرح اور بہت سے الفاظ جو مسلمانوں کے بنیادی عقائد سے تعلق رکھتے ہیں آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر اردو زبان کے ذریعے ہندوؤں کے دماغوں میں داخل ہوگئے ہیں اور اس سے ان کے مذہبی عقائد کے متاثر ہونے کا خطرہ ہے''۔ (۱۹)

مسلم لیگ کے چوتھے اجلاس میں مسلمان نمائندوں نے یہ فریاد پیش کی کہ بمبئی کے ناظم تعلیمات نے مراسلہ جاری کیا ہے کہ پبلک کے اسکولوں میں سے اردو کو الگ کر دیا جائے۔ اگر مسلمان اردو کی تعلیم جاری رکھنا چاہیں تو دینی تعلیم کی طرح اس کا اہتمام اپنے گھروں پر کریں۔ اس طرح گویا اعلان کر دیا گیا کہ ہندوؤں کا جس طرح اسلام سے کوئی تعلق نہیں اسی طرح اردو سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ (۲۰) بہار کے صوبے میں اردو میں تحریر کردہ عرضی عدالتوں میں قبول کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ مسلمان وکلاء اور دیگر اکابر نے ایک التجائی مہم شروع کی جس کی تائید ۱۹۲۵ء کے سالانہ جلسہ مسلم لیگ میں کی گئی۔ (۲۱)

۱۹۳۷ء میں کانگریسی وزارتوں کی تشکیل ہوئی تو تمام ہندو صوبوں کے وزراء اعلیٰ، برہمنوں کو بنا دیا گیا۔ اب یہ حال ہوگیا کہ ڈاک خانے والوں نے اردو میں تحریر کردہ منی آرڈر بھی قبول کرنے سے انکار کرنا شروع کر دیا اور اُن خطوط کو مکتوب الیہ تک پہنچانے سے انکار کر دیا جن پر اردو میں پتا لکھا ہوتا۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سندھ مسلم لیگ کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے اپنے خطبہ صدارت میں کانگریسی وزارتوں کو ملک کے لیے ایک مصیبت قرار دیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں بندے ماترم، ودیا مندر سکیم اور کانگریسی جھنڈے کو قومی حیثیت دینے کے خلاف مسلمانانِ ہند کے نفرت انگیز جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

> ''مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور ان کی سیاسی قوت کو تباہ کرنے کے لیے اردو کو مٹایا جا رہا ہے اور اس کے بجائے ایک ایسی زبان کو ہندوستان کے عوام کی زبان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو سنسکرت کی آمیزش سے تیار کی گئی ہے۔'' (۲۲)

کانگریسی وزارتوں کے دوران (۱۹۳۷-۳۹ء) مسلمانوں کے وجود، ثقافت اور زبان کو ختم کرنے کی بھرپور عملی کوششیں ہوئیں۔ مسلمانوں کے دیہات پر ہندوؤں نے منظم حملے کیے۔ مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ دیہات جلا دیے گئے۔ گھروں کو لوٹ لیا گیا اور پھر مسلمانوں پر جھوٹے مقدمات قائم ہوئے۔ انصاف کے دروازے ان پر بند کر دیے گئے۔ مسلم پریس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ ہندوؤں نے فیصلہ کر لیا کہ مسلمانوں کی ثقافتی زبان اردو کو ختم کر دیا جائے۔ چناں چہ اردو کتابوں پر پابندی لگا دی گئی۔ اردو اسکولوں کو بند کیا جانے لگا۔ ایک طرف مسلمانوں کے ہر ثقافتی نشان کو مٹانے کی ہر ممکن عملی کوشش کی جا رہی تھی جب کہ دوسری طرف ہندومت اور ہندو ثقافت کے ہر نشان کو ابھارنے کے لیے ہر ممکن قدم کو اٹھایا جا رہا تھا۔ اس امر کی شدت کا احساس گاندھی کے اس بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

''ہندوستان میں ہندو تہذیب کے ذریعے سوراج قائم ہوسکتا ہے۔ دھرم کی روشنی میں ضروری ہے کہ قرآن کی تعلیم کو دنیا سے نابود کردیا جائے اور اس کی جگہ راشٹر دھرم کی تعلیم مسلمانوں کو دی جائے۔ میں مسلمانوں کی گولی سے نہیں ڈرتا۔ ڈرتا ہوں تو ان کی زبان یعنی اردو سے جو برصغیر میں ان کی ثقافت اور تہذیب کی زبان ہے۔ اگر مسلمانوں کو ختم کرنا ہے تو پہلے ان کی زبان ختم کرو، ان کی ثقافت اور تہذیب خود بخود ختم ہوجائے گی۔'' (۲۳)

اس کے جواب میں قائداعظم محمد علی جناح نے ۱۹۳۹ء میں مرکزی اسمبلی کے بجٹ سیشن کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے ببانگِ دہل فرمایا تھا:

''ہندو اسلامی ثقافت وتہذیب اور اردو زبان کو مٹانے پر تلے بیٹھے ہیں لیکن میں ان کو خبردار کرتا ہوں کہ ہم مرتے مرجائیں گے لیکن اسلامی تہذیب وثقافت اور اردو زبان تباہ نہیں ہونے دیں گے۔'' (۲۴)

پنڈت جواہر لال نہرو نے کانگریس کے لیے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی خاطر مسلم ماس کانٹکٹ (مسلم رابطہ عوام) کا شعبہ قائم کیا اور اعلان کردیا کہ اب کانگریس جناح سے کوئی بات چیت نہیں کرے گی اور اس کے بجائے وہ براہ راست مسلمان عوام کے پاس جائے گی اور انھیں بہلا پھسلا کر، ورغلا کر اور بہکا کر اپنے حلقے میں کھینچ کر لے آئے گی۔ (۲۵) یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو پنڈت نہرو نے ہندوستان کی تمام صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو ذیل کا گشتی مراسلہ بھیجا۔ اس میں سے ایک اقتباس بطور حوالہ پیش کیا جاتا ہے جس سے ہندوؤں کی اردو دشمنی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔

''اس سلسلہ میں ایک اور ضروری گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے مرکزی دفتر میں اکثر شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ کانگریس کے جلسوں کے اشتہار عموماً اردو میں شائع نہیں کیے جاتے اور اس طرح مسلمانوں کو کانگریس کے جلسوں، جلوسوں کی اطلاع نہیں ہونے پاتی۔ یہ شکایت بالکل درست ہے۔ مہربانی فرما کر اپنے صوبے کی ضلع وار اور مقامی کانگریس کمیٹیوں کو سخت ہدایت کردیجئے کہ آئندہ اردو میں بھی اشتہار شائع کریں۔ بالخصوص پنجاب، یوپی اور دہلی کے صوبوں اور ہندوستان کے دیگر بڑے بڑے شہروں میں اس قاعدے کی پابندی بے حد ضروری ہے۔'' (۲۶)

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اردو کو پاکستان کی قومی زبان کی حیثیت سے بلند مرتبے پر دیکھنا چاہتے تھے۔ انھیں اردو کی اہمیت اور قوت کا اندازہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے پاکستان اور اردو زبان، دونوں کا مقدمہ بیک وقت لڑا۔ مصورِ پاکستان علامہ محمد اقبال نے بھی اردو دوستی کا حق خوب ادا کیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے ۱۹۳۶ء میں اردو کانفرنس منعقد کی اور باصرار علامہ محمد اقبال کو شرکت کی دعوت دی۔ علامہ بیمار تھے۔ آپ نے جواب میں لکھا:

''اگر اردو کانفرنس کی تاریخوں تک میں سفر کے قابل ہوگیا تو ان شاءاللہ ضرور حاضر ہوں گا۔ لیکن اگر حاضر

نہ بھی ہوسکا تو یقین جانیے کہ اس اہم معاملے میں کلیتہً آپ کے ساتھ ہوں۔ اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں۔''

اسی طرح اپنے ایک اور خط میں علامہ اقبال نے بابائے اردو کو انجمن ترقی اردو کی بابت لکھا تھا:

''آپ کی تحریک سے مسلمانوں کا مستقبل وابستہ ہے۔ بہت سے اعتبارات سے یہ تحریک اس تحریک سے کسی طرح کم نہیں جس کی ابتداء سرسیّد احمد خان نے کی تھی۔'' (۲۷)

ہندوؤں کی اردو سے مخالفت نے سرسیّد احمد خان اور دیگر اکابر سے مسلمانوں کے لیے کئی تعلیمی ادارے قائم کروائے۔ ۱۸۷۵ء میں سرسیّد نے علی گڑھ میں ایک اسکول کی بنیاد رکھی جسے ۱۸۷۷ء میں کالج کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ نواب عبداللطیف نے محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ میں قائم کی۔ اس طرح پنجاب میں انجمن حمایت اسلام کا قیام عمل میں آیا۔ سندھ میں حسن علی آفندی نے سندھ مدرسۃ الاسلام قائم کیا۔ پشاور میں تعلیمی تحریک سے متاثر ہوکر اسلامیہ کالج پشاور قائم کیا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں نواب محسن الملک نے ایک تقریر میں زور دے کر کہا کہ مسلمانوں کے تمدن کی حفاظت کا جذبہ تقاضا کرتا ہے کہ اُن کی کوئی سیاسی تنظیم ہو۔ ۱۹۰۶ء میں ان کا یہ خواب پورا ہوگیا۔ گویا اردو ہندی تنازع مسلم لیگ کی تشکیل کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ (۲۸)

ہندوؤں نے اردو کو مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت کی نشانی سمجھا۔ وہ اسے صرف مسلمانوں کی زبان سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کر دیا تھا۔ یہ لسانی جھگڑا ہندو مسلم جھگڑے ہی کا ایک حصہ تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بھارت میں ہندی کو رانی اور اردو کو باندی بنا دیا گیا جس سے ہندوؤں کا مطلب یہ تھا کہ جب مسلمانوں نے اپنا گھر الگ کر لیا تو اپنی زبان کو بھی وہی سنبھالیں۔ ہندوؤں کی لسانی تنگ نظری کے بارے میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں:

''ایک زمانہ وہ تھا جب ہندو فارسی اور عربی کے عالم ہوا کرتے تھے لیکن اردو ہندی تنازع اور سیاسی حالات نے ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دی اور وہ تعصب سے مغلوب ہوگئے۔ وہ اردو سے برگشتہ ہوکر ہندی کے حامی ہوتے گئے۔'' (۲۹)

ہماری ڈیڑھ سو سالہ سیاسی اور ملّی تاریخ شاہد ہے کہ پورے برصغیر میں مسلمانوں کی تمام قومی اور سیاسی جدوجہد کے دوران اردو اور صرف اردو کو ہی بین العلاقائی اور بین الصوبائی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس نے سب کو اتحاد و اتفاق کی لڑی میں پرویا۔ محبت اور یگانگت کا سبق سکھایا۔ سیّد احمد شہید بریلوی کی تحریکِ جہاد، تحریکِ دیوبند، تحریکِ علی گڑھ، تحریکِ ندوۃ العلماء، تحریکِ خلافت، تحریکِ آزادی، تحریکِ پاکستان اور تحریکِ اتحاد عالمِ اسلامی، ان سب اسلامی تحریکوں میں ذریعۂ اظہار اردو ہی بنی رہی۔ مسلمانوں نے پشاور و کشمیر سے لے کر راس کماری تک اور سندھ بلوچستان سے لے کر بنگال

اور آسام تک اپنے قول وفعل سے اردو کی اس عمومی اور اجتماعی حیثیت کو جانا اور مانا ہے۔اس لیے سردار عبدالرب نشتر نے کہا تھا:

''واقعاتی اور تاریخی نقطۂ نگاہ سے یہ حیثیت اردو ہی کو حاصل ہے کہ وہ پاکستان کی قومی زبان بنے۔جن چیزوں نے ہم میں یہ احساس، یہ جذبہ اور یہ ذوق وشوق پیدا کیا تھا کہ اپنا علیحدہ وطن بنائیں ان میں سے ایک اہم چیز یہ تھی کہ ہم اردو کو اغیار کی دست برد سے محفوظ کردیں۔''(۳۰)

مدیر''ادبی دنیا''مولانا صلاح الدین احمد اردو زبان کے تاریخی کردار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مسلمانانِ ہند کا باہمی اتحاد جس قدرِ مشترک پر قائم ہے، وہ ہماری قومی زبان اردو ہے، جو نہ صرف ہمارے ارتباطِ باہم کا سب سے مؤثر اور زندہ ذریعہ ہے بلکہ ہندوستان میں ہمارے ہزار سالہ تمدّن کی امین اور ہماری مذہبی، ثقافتی اور علمی روایات کی سرمایہ دار ہے۔اردو ہماری قومی زندگی اور ہماری ملّی تہذیب کا نشان بن کر نمودار ہوئی اور ہم نے اسلام کے بعد اردو کو اپنی عزیز ترین تمناؤں کا مرکز بنایا۔پاکستان کا ایوانِ عظیم الشان ہم جن محکم ستونوں پر قائم کرنا چاہتے تھے، وہ تعداد میں چار تھے: اسلام، اتحاد، آزادی اور اردو۔اور جب ہمارے قائداعظم نے ہمیں اپنی منزلِ مقصود کی طرف پکارا تھا تو ایوانِ مملکت کے انھی چار ستونوں کی نشان دہی فرمائی تھی۔''(۳۱)

اردو کا تحفظ برّصغیر میں مسلمانوں کی جنگ آزادی کا ایک مستقل حصہ رہا ہے اور یہ تاریخی اہمیت اس زبان کا طرۂ امتیاز ہے۔تحریک پاکستان میں اردو، پاکستان کی قومی زبان کے طور پر مطالبۂ تقسیم کے بعد دوسرا اور شاید سب سے بڑا ثقافتی مطالبہ، نعرہ اور وعدہ رہی ہے۔تحریکِ پاکستان کا محرکِ اوّل اگر اسلام تھا تو محرکِ دوم اردو زبان تھی اور قائداعظم کو بھی دیگر اکابر کی طرح اس حقیقت کا بخوبی علم تھا۔اردو زبان کی عظمت یہ ہے کہ برّصغیر پاک و ہند میں اس نے تاریخ لکھنے کا نہیں بلکہ مسلمانانِ ہند کی تاریخ بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔اس لیے بھی کہ اردو نے صرف ہماری تاریخ بنانے ہی کا نہیں بلکہ پاکستان کا جغرافیہ بھی بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔پاکستان کے حال اور مستقبل میں ثقافتی شیرازہ بندی، سیاسی استحکام، وحدت، ہم آہنگی، یک جہتی اور ریاستی تشخص کی ضامن اردو زبان ہی ہے۔

میرے نزدیک اردو زبان، اس کا رسم الخط اور املاء عقیدے کا مسئلہ ہے۔برصغیر میں اردو کسی کی مادری زبان ہو یا نہ ہو، یہ ہر مسلمان کی مذہبی اور ثقافتی زبان ضرور ہے اور عربی و فارسی کے بعد اسلامیانِ ہند کی واحد ترجمان ہے۔یہی وجہ ہے کہ برّصغیر پاک و ہند کا مسلمان اس زبان کی حق تلفی پر جذباتی ہو جاتا ہے۔اس کا جذباتی ہونا ایک فطری امر ہے۔کیوں کہ اردو اس کے بزرگوں کی عزیز ترین کمائی ہے جسے سینچتے، پروان چڑھاتے اور دیس بہ دیس نشر و اشاعت کرتے انھیں صدیاں گزری ہیں اور وہ اپنے بزرگوں کی اس مقدس میراث کا جائز وارث ہے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱)وَمِنْ آیَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ O سورہ الروم:۲۲(اوراس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اورزمین کی پیدائش اورتمھاری زبانوں اوررنگوں کا اختلاف۔بےشک اس میں نشانیاں ہیں جاننے والوں کے لیے)(۲) أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ O سورۃ الرّعد:۲۸(خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کواطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔)(۳)النووی،محی الدین ابوزکریا یحییٰ،الاربعون النُوَوِیَّة و شَرحُها،ص۵۹(۴)محمدحسین آزاد،مولانا،سخن دانِ فارس(لاہور:بک ٹاک ٹمپل روڈ،۲۰۰۶ء)ص۴۵(۵)قریشی،ڈاکٹرمحمداسحاق،برصغیر پاک و ہند میں عربی نعتیہ شاعری(لاہور:مرکز معارفِ اولیاء محکمہ اوقاف حکومت پنجاب،۲۰۰۲ء)ص۴۷۶(۶)خطباتِ رشید احمد صدیقی۔مرتبین:مہرالٰہی ندیم(علیگ)/لطیف الزمان خان (کراچی:مکتبہ دانیال عبداللہ ہارون روڈ،۱۹۹۱ء)ص۸۸(۷)بخاری،ڈاکٹرسہیل،لسانی مقالات،حصہ دوم(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۱ء)ص۴۱۷(۸)......ایضاً......ص۴۱۸(۹)تاراچند،ڈاکٹر،ہندوستانی زبان کا مسئلہ،(۱۹۴۴ء)(۱۰)لسانی مقالات، حصہ دوم ، ص ص ۴۱۵-۱۶ (۱۱)......ایضاً......،ص۴۱۶(۱۲)ہندوستانی زبان کا مسئلہ، (۱۹۴۴ء)(۱۳)F.E Keay, A History of Hindi Literature, P-80(۱۴)محمد اکرام،شیخ،پاکستان کا ثقافتی ورثہ(لاہور:ادارہ ثقافتِ اسلامیہ،۲۰۰۱ء)ص ص۱۲-۱۳(۱۵)زکریا،ڈاکٹررفیق،ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج(نئی دہلی:ترقیٔ اردو بیورو،۱۹۸۵ء)ص ص ۳۹۶-۹۷(۱۶)ماہ نامہ اردو(جوبلی نمبر)کراچی:نومبر۱۹۵۳ء ص ۹(۱۷)Separatism Among the Indian Muslims, P-44(۱۸)The Moslem Chronicle, May 30, 1903(۱۹)فاروقی،پروفیسر ڈاکٹرطاہر،ہماری زبان-مباحث و مسائل (کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۹۶ء)ص۹۴(۲۰)محمدمنّور،پروفیسر،پاکستان-حصارِاسلام(لاہور:گوہرسنز اردو بازار لاہور،۱۹۹۸ء)ص۲۱ (۲۱)......ایضاً......ص۲۳(۲۲)پیام شاہ جہان پوری،تاریخ نظریۂ پاکستان(لاہور:کتب خانہ انجمن حمایت اسلام،۱۹۷۰ء)ص ۳۱۹(۲۳)دیکھیے رسالہ اردو قومی زبان نمبر، ۱۹۳۸ء(۲۴)دیکھیے جمیل الدین احمد، Speeches and Writings of Muhammad Ali Jinnah جلد دوم (لاہور:۱۹۷۴ء)(۲۵)بٹالوی،ڈاکٹرعاشق حسین، اقبال کے آخری دوسال(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۹ء)ص۳۷۶(۲۶)روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ۔مورخہ ۲راپریل ۱۹۳۷ء(۲۷)ہماری زبان-مباحث ومسائل ص۴۰(۲۸)پاکستان-حصارِاسلام،ص ۲۶(۲۹)سیّدعبداللہ، ڈاکٹر،ابوالکلام آزاد-امامِ عشق وجنوں (لاہور:مکتبہ جمال،اردو بازار،۲۰۰۹ء)ص۵۰(۳۰)ہماری زبان-مباحث و مسائل،ص۴۹ (۳۱)صلاح الدین احمد،مولانا،مضمون"اردو کے چند مسائل"مشمولہ مقالاتِ شام ہمدرد مرتبہ حکیم محمد سعید (لاہور:مکتبہ جدید۱۹۶۹ء)ص۲۰۱......☆☆☆

اجتماعی اقدار کی تشکیل میں دینی مدارس کا کردار

سہیل اختر قاسمی

دینی مدارس اور اسلامی اداروں کا وجود افادیت کا حامل ہے یا مضرت کا؟ اس عنوان سے مکمل جہات کو محیط متعدد نظریات پیش کئے جا چکے ہیں، جو اپنی معتبریت، موزونیت کے اعتبار سے مکمل اور کامل ہیں۔ آج کا ہر رسالہ، اخبار اور ان سرناموں اور عنوانوں کی توضیح وتشریح کرتے ملتے ہیں کہ آیا موجودہ مدارس اپنے جلو میں امن کا کارواں رکھتا ہے یا فساد وتباہی کا آتش فشاں، اب تک مجموعی طور پر جو نظریات سامنے آئے ہیں وہ سب کے سب مدارس اسلامیہ کی شبیہ کو متوازن، امن پسند اور قومیت پسند ماننے کی تعبیر ہیں۔

اپنے وضوح (clarity) اور ایمانداری کے باوجود دینی مدارس کے دامن پر، تشدد پسندوں کی جانب سے جو الزام (دینی مدارس دہشت گرد اور امن مخالف ادارے ہیں) لگا ہے وہ واقعی تناظر میں صرف ایک تہمت کی حیثیت رکھتا ہے دراصل مدرسہ مشن سے جس خاص طبقہ (اسلام مخالف طبقہ) کو تکدر اور انقباض ہے وہی، مدرسہ مخالف کاز اور حرکات میں مساعد ومعاون ہوتا ہے، اس جہت سے اس کے افعال واعمال، مدارس مخالف ہی ہوتے ہیں، چوں کہ نظریاتی سطح پر اس مفروضے کو تشہیر دی جاتی ہے اور اسے عوامی مقامات پر نمایاں کیا جاتا ہے جس سے ذہن سازی اور فکرسازی کی راہیں بھی ہموار ہوجاتی ہیں مگر تشہیر کا سہارا اسے ناقابل تکذیب سچ بنادیتا ہے اور غالبًا اسی منہج عمل نے مدارس اسلامیہ کے پرامن ہونے کے حوالے سے غور وفکر کی راہ کھول دی ہے اور یہ دعوت دی ہے کہ مدارس کی امن پسند شبیہ کو سامنے لایا جائے اور ان کی خدمات کو اس تناظر میں جانچا جائے تاکہ زہرزدہ فضاء میں مدارس کے کردار کو زہریلی ہواؤں سے محفوظ رکھا جاسکے۔

مدارس اسلامیہ کی خشت اول امن کے گارے سے تیار ہوتی ہے اور اس کے مقاصد واہداف میں سلامتی اور تحفظ کا سایہ فگن ہوتا ہے اس واقعیت کے باوجود یہ پروپیگنڈہ کہ مدارس اسلامیہ دہشت گردی کے اڈے اور انتہاپسندی کے مراکز

ہیں، معروضیت مخالف ہیں۔

پوری دنیا میں جس مدرسہ کی بنیاد سب سے پہلے پڑی تھی وہ رحمۃ للعالمین کی زیر سرپرستی صفہ کے نام سے قائم ہوئی تھی، رحم جس کا کام، سلامتی جس کا اعلان اور تحفظ جس کا نظام تھا، اسی روشنی سے جلا پانے والے ہزاروں مدارس دینیہ گزرے دور سے لے کر آج تک اسی اساس پر قائم ہیں ہندوستان میں دینی مدارس بھی اسی نظام امن کے پیامبر اور محافظ ہیں، دینی مدارس کی بنیاد ہی امن وسلامتی کے عنوان سے بنتی ہے اور اس کی تشکیل بھی خیر وخوبی کے صدائے عام سے ہوتی ہے۔

اجتماعی اقدار کی تشکیل میں دینی مدارس کے بنیادی کردار سے انکار، ایک برملا حقیقت کا انکار ہوگا! جن بنیادوں پر ان کا قیام عمل میں آیا ہے اس کا نتیجہ اور ہدف، صالح اقدار کی تشکیل وتعمیر ہے، ان مدارس کا پس منظر یا ان کی تگ ودو (Works) کا نتیجہ، بہترین علماء، صاحب کردار فضلاء اور انسانیت کے علمبردار، حاملین اسلام کی پیداواری اور معاشرہ کی برائیوں، قباحتوں اور داخلی شورشوں کا انسداد ہے درحقیقت ان مدارس کا جو اساسی منشور اور بنیادی ہدف (Main target) ہے وہ ہے عالمی ضرورتوں کی اسلامی تکمیل یہی وہ دائرہ ہے جس کے تحت سارے مدارس کا وجود عمل میں آیا ہے، گویا اپنے عمومی اور اساسی مفہوم میں مدارس دینیہ کی تاسیس عالمی ضرورتوں کی اسلامی تحصیل وتکمیل اور انسانی احتیاجوں کی بھرپائی ہے۔ یہی مدارس کا خاص ہدف ہے اور عام ہدف بھی، ان سے گریز، یا دامن کشی، اپنی اساس سے اعراض ہوگا اور اگر ایسا ہے تو واقعی یہ المیہ اور نامسعود (Unfortunate) ہے ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ، حقائق کا صحیح اور مناسب جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہمارے دینی مدارس اپنے اساسی منشور سے تھوڑے بہت گریزاں ہیں، یہ کوئی خواہ مخواہ کا قیاس اور رائے زنی نہیں بلکہ موجودہ دینی اداروں کے اقدامات، رویوں اور عمل سے یہ بات معلوم ہوتی اور واقعی یہ بڑی تکلیف دہ ہے، اس حوالے سے دینی جامعات کو غور وفکر کی ضرورت ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہماری دینی جامعات کی گریز پائی یا دامن کشی، فقط یونہی نہیں، اس میں دینی مدارس کی جدید کاری کے عنوان سے چلنے والی تحریکات کے ردعمل کی نفسیات اور خوف کارفرما ہے اور شاید اس معاملہ میں مسلم علماء اور قدامت پسند ماہرین شرعیات کا عناد اور ہٹ دھرمی قابل معافی ہے کیوں کہ وہ ردعمل کی نفسیات ہے، اگرچہ یہ ردعمل انتہا پسندانہ اور منفی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ایسے ردعمل سے مسلم امۃ کا نقصان ہے، اس حوالے سے غور وفکر اور تدبر کے مظاہرہ کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

بہرکیف ان نقائص (جو کہ کچھ خاص حالات کے پیداوار ہیں) کے باوجود دینی مدارس کی افادیت، تعمیری حیثیت، اخلاقی ساکھ، تشکیلی امیج اور بنیادی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، آج بھی وہ مشعل راہ اور نقوش ہیں، اسے اپنا کر، اقدار کی اصلاح کر سکتے ہیں، اخلاقیات کی اشاعت ہوسکتی ہے، تعلیم کی ضرورت پوری ہوسکتی ہے، ناخواندگی کا انسداد ہوسکتا ہے، برائیوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے اور ہر طرح کی قباحتوں کو فنا کے گھاٹ اتارا جاسکتا ہے۔

درحقیقت دینی مدارس کا سارا نظام، عملہ طلبہ اور فاضلین جس کام اور مشن پر مامور ہیں وہ لاتفسدوا فی الارض کی تمثیل اطاعت پر مبنی ہے اس کا بنیادی مشن ہی معاشرے میں امن وسلامتی کی اشاعت ہے، جس قرآن وحدیث کی تعلیم ان مدارس میں ہوتی ہے اس کی خمیر ہی معاشرہ سازی اور انسانی نسل کی اصلاح وتعمیر ہے، مدارس دینیہ کے پورے مقاصد صرف اور صرف بنی نوع انسان کی اصلاح وتعمیر کے اردگرد گھومتے نظر آتے ہیں، ان مدارس کا تعلیمی جائزہ یہ بتلاتا ہے کہ دنیا کا سب سے معتدل، اور متوازن نصاب مدارس اسلامیہ میں رائج ہے جس نصاب میں تشدد، انتہا پسندی اور غلو آمیزی کا درس نہیں ہوتا ہے بلکہ امن وسلامتی، اصلاح وتعمیر اور معاشرہ سازی کی تعلیم دی جاتی ہے درحقیقت مدارس اسلامیہ کا نصاب وہ بہترین مشعل راہ ہے جس کی روشنی میں نصاب سازی اور ازسرنو تعلیمی نظام کی تخلیق پوری دنیا کو امن وسلامتی کی راہ پر لا کھڑا کرے گا، آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سورج جیسے روشن حقیقت کو سمجھا جائے اور اسے برتا جائے۔

الغرض مدارس اسلامیہ کا مکمل تعلیمی، تربیتی، اخلاقی، انتظامی، معاشی اور سماجی نظام اعتدال وتوازن کا مظہر ہے اس کا ہر حصہ قابل اعتماد، اور ہر شعبہ اعتدال وامن پسندی کا داعی ہے مدارس کے صرف وبذل میں جس اعتدال کا مظاہرہ کیا جاتا ہے وہ اقتصاد وتوازن کا اعلیٰ ترین مظہر ہے جس میں عیاشی، عیش کوشی اور سامان عیش وطرب کی فراہمی کے لیے سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کا شائبہ تک نہیں ہوتا بلکہ بنی نوع انسان کے لیے سامان درس ہوتا ہے، اس کا متوازن معاشی نظام ان تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں کو یہ درس دیتا ہے کہ کھربوں اور کروڑوں روپے خرچ کرنے اور سامان تزئین کے بے پناہ استعمال کرنے کی وجہ سے آنے والے تعلیمی خرچ میں جو اچھال پیدا ہے اور جس طرح تعلیم کو مہنگا بنا کر پیش کیا گیا ہے جس کی بناء پر ہزاروں اور لاکھوں غریب بچوں کی دسترس سے تعلیمی حصولیابی دور ہوگئی ہے وہ افسوس ناک ہے کاش کہ یہ عیاشی اور دھاچوکڑی ختم کی جائے تاکہ غریب سے غریب بچہ تعلیمی اسلحہ سے لیس ہوسکے اور علوم وفنون کا حاصل کرنا آسان ہوسکے۔

مدارس دینیہ کا انتظامی نظام وقار وسنجیدگی اور عدل ومساوات کا بہترین نمونہ ہے اگر یہ نقوش ہماری ہم عصری، عصری یونیورسٹیاں اپنالیں تو طلباء کی جانب سے ہونے والے احتجاجات اور اس کے نقصان میں ہونے والے ہرجوں سے محفوظ رہنا آسان ہوجائے گا۔

مدارس اسلامیہ کا اخلاقی نظام، اخلاق ومروت کے مظاہرہ کی دعوت دیتا ہے، سچ یہ ہے کہ طلباء علوم دینیہ کا حسن سلوک اور طرز معاشرت اتنا بلند اور ارفع ہے کہ اسے ہم سماوی رفعتوں سے تعبیر کرسکتے ہیں آج ضرورت ہے کہ دینی مدارس کے ان نقوش کو اپنایا جائے اور ریکنگ کی انتہاء پسندی جو کہ اخلاقی دہشت گردی کی ہی ایک نوع ہے، اسکا سدباب کیا جاسکے۔

الغرض دینی مدارس، سراپا امن وسلامتی ہیں اس کا کردار ماضی میں بھی صاف ستھرا اور روشن تھا آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا درحقیقت دینی مدارس، ایک ایسا مشعل ہیں جس کی روشنی میں امن کا شہر قائم کیا جاسکتا ہے اور پرامن معاشرہ کی تکمیل ہوسکتی ہے آج اس کی ضرورت ہے اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ اس ضرورت کو ضروری اور لازم سمجھا جائے۔

نتیجہ ضمنی امتحان ونظر ثانی

ادارہ

☆.....حضرت مولانا مشرف علی تھانوی صاحب دامت برکاتہم العالیہ (خازن وفاق) مورخہ 16 ستمبر 2014ء مطابق 20 ذیقعدہ 1435ھ کو مرکزی دفتر وفاق گارڈن ٹاؤن ملتان تشریف لائے۔انہوں نے ماہانہ آمد وخرچ کی تفصیلات کا جائزہ لیااور جملہ حسابات پراطمینان کا اظہار فرمایا۔

☆.....وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ضمنی امتحانات 13 تا15 ذیقعدہ 1435ھ مطابق 17 تا19 ستمبر 2014ء کومنعقد ہوئے۔ضمنی امتحان کے پرچہ جات کی مارکنگ کا عمل 19 ستمبر 2014ء بروز جمعۃ المبارک بعد نماز مغرب شروع ہوا۔مارکنگ کے عمل میں 80 ممتحنین نے حصہ لیا۔جن پر چار ممتحنین اعلیٰ مقرر کئے گئے تھے۔حضرت ناظم اعلیٰ وفاق مدظلہم کی ہدایت کے مطابق حضرت مولانا ارشاد احمد صاحب مدظلہم (رکن مجلس عاملہ وامتحانی کمیٹی) مارکنگ کے پورے عمل کی نگرانی فرماتے رہے۔

☆.....مورخہ 22 ستمبر کو حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم ناظم اعلیٰ وفاق، نے دفتر وفاق کا دورہ فرمایا۔اس دوران انہوں نے مارکنگ کے عمل کا جائزہ لیااور ممتحنین کو ضروری ہدایات جاری فرمائیں۔27 ستمبر بروز ہفتہ کو ضمنی امتحان کے پرچہ جات کی مارکنگ کا عمل مکمل ہوا۔

☆.....وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے صدر حضرت الشیخ مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم العالیہ اور ناظم اعلیٰ وفاق حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب مدظلہم نے ''وفاق المدارس'' سے ملحق دینی مدارس وجامعات کے ضمنی امتحان برائے سال 1435ھ/2014ء کے نتائج کا اعلان مورخہ یکم اکتوبر 2014ء مطابق 5 ذوالحجہ 1435ھ کو کر دیا ہے۔ملک بھر میں طلبہ وطالبات کے کل 180 امتحانی مراکز قائم کیے گئے تھے۔ضمنی امتحان کے لئے 29443 طلبہ و طالبات کو رول نمبر جاری ہوئے۔

ان میں سے 11513 طلبہ نے امتحان میں شرکت کی۔8999 طلبہ پاس اور 2514 طلبہ ناکام ہوئے،طلبہ کا نتیجہ

78 فیصد رہا۔اسی طرح 16549 طالبات نے امتحان میں شرکت کی، جن میں سے 11397 پاس اور 5152 ناکام ہوئیں۔طالبات کا نتیجہ 69 فیصد رہا۔

مجموعی طور پر 28062 طلبہ وطالبات نے امتحانات میں شرکت کی۔ان شرکاء میں سے 20396 نے کامیابی حاصل کی اور 7666 ناکام ہوئے۔اس طرح مجموعی طور پر نتیجہ 73 فیصد رہا۔

اجمالی نتیجہ ضمنی امتحانات ۱۴۳۵ھ/2014ء

درجہ	ممتاز	جید جیداً	جید	مقبول	راسب	غائب	ضمنی	موقوف کالعدم	موقوف	میزان	فیصد نتیجہ
عالمیہ بنین	4	138	420	310	150	108	113	3	1	1247	77%
موقوف علیہ	9	96	106	95	37	18	1	--	--	362	89%
عالیہ بنین	13	260	537	739	136	69	9	--	--	1770	91%
خاصہ بنین	15	341	824	1226	536	109	47	13	12	1247	80%
عامہ بنین	30	298	571	1159	708	134	23	9	2	2934	74%
متوسطہ	11	523	674	384	201	99	489	2	--	2383	70%
دراسات اول	3	11	6	8	3	6	1	--	--	38	88%
دراسات دوم		5	2	1	--	--	--	--	1	9	89%
تجوید للحفاظ	22	81	32	7	1	9	6	--	--	158	95%
تجوید للعلماء		28	8	2	3	6	--	--	--	47	93%
عالمیہ بنات	1	406	1246	395	371	226	948	5	6	3604	61%
عالیہ بنات	11	345	1503	3496	1038	198	29	14	4	6440	83%
خاصہ بنات	6	143	280	855	855	121	80	12	--	2382	57%
عامہ بنات	5	181	546	1837	1589	261	110	16	--	4545	60%
دراسات اول	2	12	7	20	27	7	--	--	--	75	60%
دراسات دوم		3	8	21	9	4	1	--	--	46	76%
تجوید للحافظات	--	3	--	--	1	--	--	--	--	4	75%

تجوید للعالمات	2	34	27	2	7	6	--	--	--	78	90%
میزان:-	134	2908	6797	10557	5702	1381	1857	26	81	29443	73%

☆.....☆.....☆

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سالانہ امتحان 1435ھ
کے پرچہ جات پر نظر ثانی کے بعد پوزیشنوں میں تبدیلی

وفاق المدارس کے سالانہ امتحان 1435ھ کے پرچہ جات پر نظر ثانی کا عمل مکمل ہو چکا ہے۔امسال مجموعی طور پر 11196 پرچہ جات پر نظر ثانی ہوئی ہے۔ بعد از نظر ثانی پوزیشنوں میں متعدد تبدیلیاں سامنے آئی ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

☆.....**عالمیہ بنین صوبائی پوزیشن خیبر پختونخوا:**

جامعہ عثمانیہ پشاور کے شفیع اللہ نے 519 نمبروں کے ساتھ تیسری پوزیشن حاصل کی ہے۔

☆.....**عالمیہ بنین صوبائی پوزیشن پنجاب:**

جامعہ معہد الفقیر الاسلامی جھنگ کے طالب علم محمد نعیم الرحمٰن نے (دوسری پوزیشن کے مساوی) 501 نمبروں کے ساتھ دوسری پوزیشن حاصل کی۔

☆.....**عالمیہ بنین صوبائی پوزیشن بلوچستان:**

بعد از نظر ثانی جامعہ دار العلوم چمن کے طالب علم حبیب الرحمٰن نے 486 نمبروں کے ساتھ اول پوزیشن حاصل کی ہے۔

☆.....**خاصہ بنین صوبائی پوزیشن پنجاب:**

جامعہ دار العلوم کبیر والا کے طالبعلم زین اللہ بن غلام قادر نے (دوسری پوزیشن کے مساوی) 576 نمبر حاصل کر کے دوسری پوزیشن حاصل کی۔

☆.....**خاصہ بنات ملکی پوزیشن وصوبائی پوزیشن سندھ:**

جامعہ اسلامیہ ام حبیبہ للبنات کراچی کی طالبہ کلثوم نے (ملکی دوم پوزیشن اور صوبہ سندھ کی اول پوزیشن کے مساوی) 588 نمبر حاصل کر کے ملکی دوم اور صوبہ سندھ میں اول پوزیشن حاصل کی۔

☆.....**خاصہ بنات صوبائی پوزیشن گلگت بلتستان:**

جامعہ اسلامیہ نصرت الاسلام گلگت کی طالبہ بنایہ نے 489 نمبروں کے ساتھ پہلی پوزیشن حاصل کی، اس سے قبل صرف ایک طالبہ نے 477 نمبر (ممتاز) حاصل کیے تھے، اب وہ اول سے دوم پوزیشن پر آ گئی۔